Scanned by CamScanner

دریافت

شمارہ - چھے

(ISSN 1814-2885)

مدیر اعلیٰ
بریگیڈیئر (ر) ڈاکٹر عزیز احمد خان
ریکٹر

مدیر
ڈاکٹر رشید امجد

مدیر معاون
عابد سیال

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

numl_urdu@yahoo.com

Scanned by CamScanner

دریافت

شمارہ - چھے

(ISSN 1814-2885)

مدیر اعلیٰ
بریگیڈئر (ر) ڈاکٹر عزیز احمد خان
ریکٹر

مدیر
ڈاکٹر رشید امجد

مدیر معاون
عابد سیال

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

numl_urdu@yahoo.com

Scanned by CamScanner

مجلس مشاورت

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی — شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، بھارت

ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری — شعبہ ایریا سٹڈیز (ساؤتھ ایشیا)، اوساکا یونیورسٹی، جاپان

ڈاکٹر بیگ احساس — شعبہ اردو، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن، بھارت

سویامانے یاسر — شعبہ ایریا سٹڈیز (ساؤتھ ایشیا)، اوساکا یونیورسٹی، جاپان

ڈاکٹر محمد آفتاب احمد — نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ڈاکٹر گوہر نوشاہی — نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

پروفیسر رفیق بیگ — نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جملہ حقوق محفوظ

مجلہ ---------- دریافت (ISSN # 1814-2885)

اشاعت ---------- سالانہ

شمارہ ---------- چھے - اگست دو ہزار سات

سرورق ---------- عابد سیال

ناشر ---------- نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، H-9، اسلام آباد۔

پریس ---------- نمل پرنٹنگ پریس، اسلام آباد۔

ای میل شعبہ اردو ---------- numl_urdu@yahoo.com

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

Scanned by CamScanner

ترتیب

اداریہ	بریگیڈئر (ر) ڈاکٹر عزیز احمد خان	7
❁		
محمد مومن خان مومن: سوانح و شخصیت	ڈاکٹر جمیل جالبی	9
سن ستاون کی دلی	ڈاکٹر تبسم کاشمیری	37
مدح کے چند عمومی محرکات	ڈاکٹر سعادت سعید	117
لطف اللہ مہندس: تاج محل کا ایک معمار	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	137
کلام غالب میں صنعتِ ادماج	ڈاکٹر محمد ساجد خان	143
دیوان غالب نسخہ عرشی کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ	محمد سعید	170
اردو صحافت اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس	صوفیہ یوسف	213
اردو کا ایک قدیم رسالہ۔ سین ٹیفک ٹری ٹیز	ہاشم شیر خان	221
تاریخ ادب اردو: ۱۷۰۰ء تک میں منقول تاریخوں کا تحقیقی مطالعہ	ابرار عبدالسلام	238
محمد حسین آزاد اور غالب تنقید	جاوید رحمانی	272
میں کیہ جاناں کون: کبیرا	شاکر کنڈان	298
زیارت لائبریری مکھڈ شریف کے چند فارسی مخطوطات	محمد ساجد نظامی	355

Scanned by CamScanner

ادب کے تاثرات	بریگیڈئر (ر) ڈاکٹر عزیز احمد خان	377
مغرب کے افسانوی ادب میں بلوراتی کردار	ڈاکٹر خالد سنجرانی	405
دیباچہ فسانہ عجائب: اصطلاحات و محاسن	ڈاکٹر سہیل عباس بلوچ	433
اردو کا نظام علامت	خواجہ غلام ربانی مجال	583
اردو کا موزوں ترین رسم الخط	شکیل پتافی	591
اردو کا لسانی سرمایہ	عائشہ سعید	607
سومیری اور بلوچی زبان کے اشتراکات	واحد بزدار/ چراغ ودار	637
اقبال کا پہلا خطبہ: تحقیقی و توضیحی جائزہ	ڈاکٹر محمد آصف اعوان	647
علامہ محمد اقبال کا تصور تاریخ	ڈاکٹر راشد حمید	671
روشن خیالی اور اعتدال پسندی کی ادبی جہتیں	ڈاکٹر نجیب جمال	698
اردو شاعری میں حریت فکر کی روایت	ڈاکٹر غلام شبیر رانا	707

Scanned by CamScanner

محمد خالد اختر کی تبصرہ نگاری	ڈاکٹر وحید الرحمن خان	715
فراق کی تنقید	ناصر عباس نیر	750
مجید امجد کی شعری لفظیات کا مطالعہ	ڈاکٹر عامر سہیل	765
کلام فیض میں ہاتھ کی علامت	ڈاکٹر ریاض قدیر	788
خودنوشت سوانح عمری اور حافظ لدھیانوی	شبیر احمد قادری	802
پطرس بخاری کی تنقید نگاری	ایم۔ خالد فیاض	814
"لوگول" سے موجودہ فرانس تک	ڈاکٹر شذرہ منور	837
رسمیاتِ مقالہ نگاری	ڈاکٹر معین الدین عقیل	863

قلمی معاونین 924

Scanned by CamScanner

اداریہ

تحقیق و تنقید میں جو ایک باہمی ربط ہے اس کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں۔ محقق کے سامنے ابتدا میں کوئی ٹھوس مواد نہیں ہوتا وہ ایک مفروضہ یا خیال سے شروع کرتا ہے اور جستجو و عرق ریزی کے بعد کوئی شے دریافت کرتا ہے، یہ سارا عمل تحقیق سے متعلق ہے۔ لیکن دریافت شدہ شے کے بارے میں رائے دینا، حکم لگانا یا اس کے دیگر معاملات کا تعین کرنے کے لیے ایک تنقیدی شعور کی ضرورت ہے۔ اس تنقیدی شعور کے بغیر محقق ممکن ہے محض قیاس کی بنیاد پر غلط فیصلہ دے دے۔ اس کے برعکس نقاد کے سامنے ٹھوس مواد ہوتا ہے اور اسے اس مواد کی اچھائیوں یا خامیوں کی نشاندہی کرنا ہوتی ہے اور بعض اوقات اس کے لیے اسے تقابلی مطالعے کے عمل سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ یہاں اسے تحقیقی شعور کی ضرورت پڑتی ہے، ورنہ یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ دستیاب مواد کے بارے میں تو وہ رائے دے دے لیکن جستجو کے بعض مراحل میں تحقیقی شعور نہ ہونے کی وجہ سے اس کی رائے صائب نہ رہے۔ سو دونوں صورتوں میں تحقیق و تنقید کے عمل سے گزرتے ہوئے، ایک دوسرے کی معاونت ضروری ہے۔

تحقیق و تنقید، تخلیق سے پورے طور پر جڑے ہوئے عامل ہیں۔ یہاں بنیادی و ثانوی کی تمیز ایک اضافی معاملہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تحقیق، تنقید سے الگ ایک گنبد بے در اور تنقید، تحقیق کے بغیر ایک پیکر بے رس ہے۔ خارجی و باطنی سطح پر ہر دو کے جڑاؤ ہی سے حقائق کی بازیافت ممکن ہے۔ عموماً خیال یہی ہے کہ تحقیق و تنقید کے زاویے ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں اور ہدف کے گھیراؤ میں یہ منفرد حیثیتوں سے عمل پیرا ہوتے ہیں؛ یہ یقیناً درست ہے لیکن اس سے ہر دو کے درمیان گہرے تفاعلی رشتوں کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ زیادہ وسیع تر مفہوم میں دیکھا جائے تو تحقیق و تنقید کے عمل کا تخلیقی عمل کے ساتھ ہی آغاز ہو جاتا ہے۔ فنکار جہاں اپنے ذہن و وجدان کے تجربات پر گرفت پانے کی کوشش کرتا ہے وہاں ان کی ماہیت اور جانچ پرکھ

Scanned by CamScanner

بھی اہم ہو جاتی ہے۔ کسی فن پارے کی عمر کی اسی پر منحصر ہے کہ اس کی تجسیم میں تخلیقی و تنقیدی شعور کی یکجائی بطریق احسن ہوئی ہو۔

تحقیق و تنقید کے حوالے سے زمانی ابعاد اور ہیئت مکانی ایسے عناصر ہیں جو تعین حقیقت میں تنوع اور تبدل کا باعث بنتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیق کے وقت خود فنکار کی طرف سے طے کردہ سانچے معاصرین کی طرف سے بنائے گئے چوکھٹے اور متاخرین کے وضع کردہ معیارات، جمیعہ کی تمام تر کوششوں کے باوجود ایک لچکدار حیثیت رکھتے ہیں جس میں نو بہ نو اضافے کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ دریافت کے عمل میں ایک قابل قبول معیار تک رسائی تحقیق و تنقید کے متوازن ارتباط اور تعلق و تفاہم ہی سے ممکن ہے۔ یہ رویہ ہر دو فنون کے انفرادی زاویوں سے نمو پاتا ایک دائروی عمل ہے جو ادغام کی تمام تر صورتوں کے باوجود اپنے منابع کی ہیئت اصلی کو مسخ نہیں کرتا۔

☆

'دریافت' کا چھٹا شمارہ پیش خدمت ہے۔ ہم نے ہمیشہ کہا ہے کہ کسی بھی پرچے کا معیار اس کے لکھنے والے ہوتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ 'دریافت' کو ابتدا ہی سے اچھے لکھنے والوں کا تعاون حاصل رہا ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ یہ معیار آئندہ بھی قائم رہے۔

بریگیڈئر (ر) ڈاکٹر عزیز احمد خان

ریکٹر

Scanned by CamScanner

ڈاکٹر جمیل جالبی

محمد مومن خان مومن: سوانح و شخصیت

The article covers the biography & personality of Momin a prominent poet of 19th century. He was a contemporary poet of Ghalib & Zauq. In this article research has been made to find out his exact year of birth adn the different aspects of his biography in order to correct the mistakes and this concepts of critics, and biographers. This study of his life & perosnality helps to understand his poetic nature & unique style of his art.

شاہ عالم ثانی کے دور شاہی (۴ جمادی الاوّل ۱۱۷۳ھ۔ ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ/۲۵ دسمبر ۱۷۵۹ء۔ ۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء) میں کشمیر سے دو بھائی: نامدار خاں اور کامدار خاں دہلی آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ یہ دونوں حکیم تھے۔ دست شفا سے جلد ہی چمک اٹھے اور چند ہی سال میں ان کی شہرت سارے شہر میں پھیل گئی۔ ۶ جنوری ۱۷۷۲ء کو جب شاہ عالم دہلی آئے تو کچھ عرصے بعد یہ دونوں بھائی شاہی طبیبوں کے زمرے میں شامل کر لیے گئے اور پرگنہ نارنول میں چند گاؤں، جن میں پلاہہ بھی شامل تھا بطور جاگیر انہیں عطا ہوئے اور یہ دونوں شاہی طبیب کے منصب پر فائز ہو کر باعزت زندگی گزارنے لگے۔ آنے والے زمانے نے دیکھا کہ اس خاندان سے ایسے اطبا پیدا ہوئے جن کے نام ہماری تاریخ کا حصہ ہیں۔ حکیم نامدار خاں کے تین بیٹے

Scanned by CamScanner

حکیم غلام حسن خاں اور حکیم غلام نبی خاں (م ۱۲۳۱ھ) ۱۱۔ مومن کے

چچے حکیم غلام حیدر خاں، حکیم غلام

قطعہ تاریخ وفات کے آخری مصرع "تو قد فاز فوزا عظیما کہا" سے ۱۲۳۱ھ برآمد ہوتے ہیں۔

حکیم غلام نبی خاں بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے لیکن سب سے پہلے وفات پا گئے۔ یہی

حکیم غلام نبی خاں مومن خاں کے والد ماجد ہیں۔

محمد مومن خان (۲) نام، مومن تخلص (۱۲۱۴ھ۔ ۱۲۶۸ھ/۱۸۰۰۔۱۸۵۲ء) دہلی کے

محلہ کوچہ چیلان میں پیدا ہوئے اور ساری عمر دہلی میں گزار دی:

ہو صورت خاک دل تکنے کی جنت میں بھلا مومن

مری نظروں میں ہے شاہجہاں آباد کا نقشہ

اکثر تذکرہ نویسوں نے مومن کا سال ولادت ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء دیا ہے لیکن قوی معاصر شہادت کے پیش نظر یہ درست نہیں ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اس دیباچے میں، جو ان کے مرتبہ دیوان مومن مطبوعہ دہلی ۱۸۴۶ء پر لکھا گیا ہے، بتایا ہے کہ

"دریں زمانہ کہ تہذیب ایں دلفریب بستان اتفاق افتاد واز ہجرت ہزار ودو صد وچہل وسہ (۱۲۴۳) سال بر وفق ہلال گشتہ بود وسنین عمرش کہ چوں عمر خضر از حد شمار برگراں باد بہ بست وشش رسیدہ واز بس کہ ایں دیوان بے نظیر است، بشمار حروف "دیوان بے نظیر" است" (۳)

اس سال سے سال ولادت ۱۲۱۴ھ برآمد ہوتا ہے اسی طرح مثنوی "شکایت ستم" (سال تکمیل ۱۲۳۱ھ) میں خود مومن نے اپنی عمر سترہ برس بتائی ہے۔ "شکایت ستم" کا وہ شعر یہ ہے:

دیکھیں آگے دکھائیں کیا کیا دن

ہے ابھی سترہ برس کا سن

اس سے بھی سال ولادت ۱۲۱۴ھ برآمد ہوتا ہے۔

مومن خاں کی پیدائش پر حکیم غلام نبی خاں حضرت شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں

Scanned by CamScanner

پیدا ہوا تو بچے کے کان میں اذان دینے کی فرمائش کی۔ شاہ صاحب نے اذان دی اور بچے کا نام محمد مومن خاں تجویز کیا۔ گھر والوں نے حبیب اللہ نام تجویز کیا تھا لیکن شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہی نام رکھیے اور یہی وہ نام ہے جس سے وہ آج تک پہچانے جاتے ہیں۔

قرین قیاس ہے کہ مومن کی ابتدائی تعلیم مدرسہ شاہ عبدالعزیز میں ہوئی۔ شاہ عبدالقادر سے تعلیم حاصل کرنے کا ذکر اکثر تذکروں میں ملتا ہے (۴)۔ عربی زبان سے انھیں واقفیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انشائے مومن میں عربی فقرے اور قرآن و حدیث کے حوالے اور ان کا بے تکلف استعمال عام ہے۔ نواب اعظم الدولہ سرور نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ "نوجوانے ست ہمت بر تحصیل کتب عربی مصروف دارد" (۵)۔ فارسی زبان پر مومن کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ معاصر تذکروں میں فارسی زبان پر ان کی قدرت کا ذکر آیا ہے۔ شیفتہ نے لکھا ہے کہ "باوجود تخالف لسانین بہر دو لفظ چنداں دست گاہے نصیب او گشتہ کہ پارسیان از آں خودی انگارند" (۶)۔ ان کی فارسی دانی کے بارے میں ایک اور معاصر مرزا قادر بخش صابر دہلوی نے بھی یہی لکھا ہے کہ "کمال مہارت فارسی سے کوس لمن الملک کی صدا نے ہند سے فارس تک پہنچ کر طوطی ہند و بلبل شیراز کو دم بخود کر دیا تھا" (۷)۔

مومن حافظ قرآن بھی تھے جس کا ذکر انھوں نے اپنی مثنوی "شکایت ستم" (۱۲۳۱ھ) میں کیا ہے۔ اعظم الدولہ سرور نے بھی اپنے تذکرے میں انھیں "حافظ محمد مومن" لکھا ہے (۸)۔ ان کا حافظہ بھی کمال کا تھا۔ عرش گیاوی نے لکھا ہے کہ "ذہن خداداد کا یہ عالم تھا کہ شاہ صاحب کا وعظ جو علاوہ علوم ظاہری کے نکات باطنی سے بھی بہرہ ہوتا تھا، جو ایک روز سن لیتے تو بے فرق دوسرے روز اپنے والد کے مطب میں بیٹھ کر دہرا دیتے تھے" (۹)۔ طب ان کا خاندانی پیشہ تھا۔ اسے بھی انھوں نے حاصل کیا اور اپنی ذہانت سے اس میں مہارت حاصل کی سعادت خان ناصر نے انھیں "مسیحا نفس، حکیم بے نظیر، شاعر بے عدیل" (۱۰) لکھا ہے لیکن ساری عمر باقاعدگی سے مطب نہیں کیا۔ صرف خاص موقعوں پر نبض دیکھ کر نسخہ تجویز کیا۔

Scanned by CamScanner

عبد اللطیف صاحب سے عشق بھی، یکہ کری پیدا ہوا تھا۔ "انشائے مومن" میں بھی متعدد مقامات
پر ۱۱۰۰۰ وغیرہ کا ذکر بار بار آیا ہے۔ کسی نواب کے نام خط میں لکھا ہے کہ "جناب کے پاؤں کے
دوائیں میں نے بھیجی ہیں ان میں سے
پامال کر دیا ہے
مجھ کو مجھے کے درد نے
نفع ہو اس سے مطلع فرمایا جائے۔"(۱۱) اکثر اپنا علاج بھی خود ہی کرتے تھے۔ ایک خط میں
لکھا ہے کہ "تین دن ہوئے کہ اپنی رائے سے منضج کی دوا پی رہا ہوں (۱۲)۔ نواب جھجر کے ہاں
تین ماہ تک طبیب خاص کی خدمت پر مامور رہے اور نواب کی بے رخی دیکھ کر وہاں سے چلے
آئے۔ شارح نے لکھا ہے کہ "طب میں خوب دخل رکھتے تھے۔"(۱۳)

طب کے علاوہ علم نجوم اور رمل سے بھی گہری واقفیت رکھتے تھے۔ معاصرین نے ان
کے کمالات اور پیش گوئیوں کا ذکر کیا ہے۔ ہر سال رفتار نجوم کی تقویم تیار کرتے تھے جن میں
سے دو تقاویم اور تین تقویموں کے دیباچے ۱۲۳۸ھ، ۱۲۳۹ھ، ۱۲۵۰ھ اور ۱۲۵۲ھ کا احاطہ
کرتے ہیں۔ "انشائے مومن" میں محفوظ ہیں۔ طب، نجوم اور رمل وغیرہ کی اصطلاحات کو اپنی
شاعری میں بھی ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ اختر شناسی کا ذکر کلیات مومن میں کئی جگہ آیا ہے۔ جادو
ٹونے اور عملیات سے بھی دلچسپی تھی۔ ایک خط میں لکھا ہے کہ "از دیروز کہ دوشنبہ روز نیر اصغر بود
عزائم خوانی بعمل آمد۔"(۱۴) مثنوی "حنین مغموم" میں بد بلانے نئی محبوبہ کے کان بھر کر
الزامات لگائے ہیں، ان میں عمل خوانی اور جادو و تسخیر کا الزام بھی شامل ہے اور مومن اپنی صفائی
میں یہ کہتے ہیں۔

میں کہاں افسوں کہاں کس کا مجال
انتقام چشم جادو کا خیال
ابتدا سے منکر تسخیر ہوں
عامل افغان بے تاثیر ہوں

شطرنج سے بھی انہیں گہری دلچسپی تھی۔ اپنے زمانے کے مشہور شاطر اور قرابت دار

Scanned by CamScanner

کرامت علی خاں سے شطرنج کھیلتے تھے اور دن رات کو بھول جاتے تھے۔ کرامت علی خاں کی وفات (۱۲۵۹ھ) پر قطعہ تاریخ وفات (۱۵) انھوں نے کہا اس میں بھی شطرنج کی اصطلاحات منصوبہ، مات، خانہ، کشت، شہ رخ، رُخ، بساط وغیرہ سے اپنے دل کی بات ادا کی ہے۔

مومن مرد آزاد اور عاشق مزاج انسان تھے۔ ۲۶ سال کی عمر تک انہوں نے شادی نہیں کی اور عشق و عاشقی میں لگے رہے۔ اس میں وہ اتنے بدنام ہو چکے تھے کہ والد نے اپنے اکلوتے بیٹے کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا جس کی تصدیق مثنوی "حکایت ستم" کے ان اشعار سے بھی ہوتی ہے جب ان کے عشق کا پردہ فاش ہوگیا اور بدنامی ہوگئی تو گھر والوں نے بلا کر ان سے کہا

آرزو تھی کہ نکلیں گے ارماں
کد خدائی کے کرتے تھے ساماں
نسبتوں کے کلام تھے کیا کیا
جا بہ جا سے پیام تھے کیا کیا
سن کے ایسے صفات نامعقول
نہ کرے گا کوئی جہاں میں قبول

والد کی وفات کے بعد انھوں نے پہلی شادی سردھنہ میں سعد علی خان بہادر کے خاندان میں کی اور جب یہ شادی ناکام ہوگئی تو ایک خط میں لکھا کہ "سعد علی خاں بہادر ہمارے خاندان کے غلاموں میں سے تھا جس کو بیگم شمرو (اس ذلیل شخص کی آقا تھی) کی دولت مل گئی تھی۔ چنانچہ اس کا نام نجف خاں اور نجیب خاں کی ہم نشینی کی بدولت تاریخ عالم شاہی اور سیر المتاخرین میں رہ گیا۔" (۱۶) یہ شادی ۱۲۴۲ھ میں ہوئی۔ "انشائے مومن" کے ان دو خطوں سے شیخ ضامن کرم کے نام ہیں مومن کی اس تلخی کا اندازہ ہوتا ہے اس شادی کے بعد ان میں پیدا ہوئی اور جب شیخ ضامن کرم نے صلح صفائی کے لیے مومن خاں کو دوبارہ سردھنہ

Scanned by CamScanner

آنے کی صورت ہوئی تو انہوں نے لکھا کہ "میں نے دو تین مہینے ناداری و بے سامانی کے ہاتھوں کے ساتھ جانے کی غلطی کی تھی ۔ اب جب کہ میں فارغ البال اور خوش حال ہوں خدا نہ کرے کہ پھر اپنے آپ کو مصیبت میں پھنساؤں اور نادانوں کی مجلس میں شریک ہوں۔" (۱۷) اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "اگر میں نے حرام سے توبہ کی ہے تو حلال تو ترک نہیں کیا۔ اگر آوارہ گردی سے پاؤں اٹھایا ہے تو نکاح سے تو ہاتھ نہیں اٹھایا۔ چونکہ میں نے نابکار جاہلوں سے تکلیف اٹھائی ہے اور بد اطوار گنواروں سے رشتہ کرنے میں مصیبتیں جھیلی ہیں اس لیے ارادہ ہے کہ کسی عالی خاندان سے قرابت کروں اور کسی شریف النسل زہرہ جمال کے دیدار سے آنکھوں کو تسکین دوں ورنہ دو تین جگہ سے نکاح کا پیغام اور وصال کا مژدہ آیا ہے۔ اگر وہ شخص (خسر) انصاف سے کام لے تو قیامت تک اس نسبت سے کہ میں اس کی لڑکی کو عقد نکاح میں لایا ہوں فخر و نازش کے سوا کوئی لفظ زبان پر نہ لائے ۔ افسوس صد افسوس کہ میں نے اپنی بلند مرتبت کے پاؤں گھاس کوڑے سے تباہ کیا۔" (۱۸) اپنے عالی خاندان ہونے کا احساس، ناقدری زمانہ کی شکایت اور اس شادی سے احساس محرومی اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ تلخی ان کے مزاج کا حصہ بن گئی مومن کی اس تصویر سے بھی نمایاں ہے "دیوان مومن" مرتبہ ضیا احمد بدایونی اور "حیاتِ مومن" از عرش گیاوی میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ اس کے بعد معلوم نہیں ہوتا کہ اس پہلی بیوی کا کیا ہوا۔ دوسری شادی انہوں نے خواجہ میر درد کے نواسے خواجہ محمد نصیر محمدی رنج دہلوی کی بیٹی سے ۱۲۴۵ھ میں کی۔ اس شادی کے بعد ان کا آخری عشق، جس کی روئیداد مثنوی آہ و زاری مظلوم (۱۲۴۶ھ) میں منظوم کی ہے، ناکامی پر ختم ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے کوئی عشقیہ مثنوی نہیں لکھی۔ اس دوسری شادی کے قطعہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سرو کی طرح آزاد مومن نے زنجیر پہن کر اسیری قبول کر لی ہے۔

یعنی آں مومن آوارہ کہ در آزادی

بہ جہاں ضرب مثل بود چو سرو آزاد

این زماں پائے بہ زنجیر تعلق گشتہ
یوسفے بود سرد کار بہ زنداں افتاد
چہ خوش ایں واقعہ را گفت اسیرے تاریخ
مرغ بے بال و پر اندر قفس آمد فریاد (۱۹)

۱۲۲۷ھ میں ان کے ہاں احمد نصیر خاں پیدا ہوئے۔ نواب اصغر علی خاں اصغر کا قطعہ تاریخ دیوان نسیم میں مو د ہے۔ ۱۲۵۸ھ میں ایک لڑکا اور ۱۲۵۹ھ ایک بنی محمدی بیگم پیدا ہوئی۔ ان دونوں کے قطعات ولادت مومن نے خود کہے۔ ۱۲۶۱ھ میں ایک اور لڑکا پیدا ہوا دو سال بعد ۱۲۶۳ھ میں مر گیا اور ایک لڑکی فاطمہ سلطان بیگم ۱۲۶۵ھ میں مر گئی۔ (۲۰) جس کا قطعہ وفات مو د ہے۔

مومن نے اپنے عشق کو کبھی نہیں چھپایا بلکہ مثنویاں لکھ کر ان عشقوں کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ اپنے خطوط میں بھی وہ اپنے عشق کا اظہار بلا تکلف کرتے ہیں۔ حکیم احسن اللہ خاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ "آج کل میں کسی کے گیسو کے خم میں تازہ اسیر ہوا ہوں۔" (۲۱) ایک اور خط میں لکھا ہے کہ "دل ہاتھ سے دینا اور دل پر ہاتھ رکھنا محال ہے۔ کسی کے انتظار میں لگے رہنا اور پھر بھی اپنے کو قابو میں رکھنا محض خیال ہے۔ میں ہوں اور آنسوؤں کی جھڑی ..... کسی کے قامت کے الف نے میرے خیال کی قوت زائل کر دی ہے۔ (۲۲) عشق و عاشقی ان کا مزاج تھی۔ اس میں وہ اتنے بدنام تھے کہ دنیا جہاں ان کے اس مزاج سے واقف تھی۔ "تف آتشیں" والی محبوبہ نے اسی لیے تف کیا تھا۔ اس مثنوی میں اپنے مزاج عاشقی کو خود بھی بیان کیا ہے:

اور ہمیں بھی چاہ کا چسکا
عشق دل و جاں کاہ کا چسکا
مہر دشوں سے لاگ سی دل کو
گرم رکھے اک آگ سی دل کو

Scanned by CamScanner

اک شے اک سے کام ہی رہوے

ہم سدا بدنام ہی رہوے (۲۳)

مومن دہلی کے ایک سربرآوردہ خاندان کے چشم و چراغ تھے اور اس طرح زندگی بسر کرتے تھے جس طرح اس دور کے روسا کا شیوہ تھا لیکن مالی اعتبار سے ان کی حالت خستہ تھی۔ عبدالقادر خاں چیف رامپوری نے لکھا ہے کہ ''اکنوں مانند دیگر خاندان ہائے دہلی بہ عسرت بسری برودند۔'' معاشی بدحالی کی یہ صورت، انگریزوں کے تسلط کے بعد، نہ صرف دہلی بلکہ سارے ہندوستان میں عام طور پر نظر آتی ہے۔ مومن کے فارسی خطوط سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ پلاہہ پرگنہ نارنول میں جاگیر شاہ عالم ثانی نے اس خاندان کو دی تھی، دہلی پر انگریزی کے قبضے کے بعد، جھجر کا سارا علاقہ کمپنی بہادر کے وفادار نواب فیض محمد خاں کو دے دیا گیا تھا اور اسی کے ساتھ مومن خاں کے اسلاف کی یہ جاگیر بھی نواب فیض محمد خاں کی جاگیر میں چلی گئی تھی جس کے عوض ایک ہزار روپیہ اس خاندان کے ورثاء کو ملتا تھا جس میں مومن کا بھی حصہ تھا اور یہ بھی باقاعدگی سے وقت پر نہیں ملتا تھا۔ مومن نے ایک خط میں لکھا تھا کہ ''خزانچیوں کی زیادتی کی دہائی کہ اتنی بے تکلفی کے باوجود زر سالانہ نہیں بھیجا۔ نواب صاحب کی ضمانت سے بھی کام نہیں نکلا۔ ایک مہینے کا وعدہ سو ماہ کے برابر ہو گیا۔'' (۲۴) مومن کی مالی حالت اتنی خراب تھی کہ سسرال سے ملا ہوا مکان بھی فروخت کر دیا تھا۔ ایک اور خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا کوئی اور مکان بھی بیچنا چاہتے تھے اور اسی لیے اسے کرائے پر دینا نہیں چاہتے تھے۔ (۲۵) وہ زمین مومن خاں کو ورثے میں اپنی والدہ کی طرف سے ملی تھی اسے بھی انگریز ریذیڈنٹ فریزر نے زبردستی چھین لیا تھا۔ یہ وہی فریزر ہے جسے نواب شمس الدین خاں نے قتل کر دیا تھا اور پھانسی چڑھے تھے۔ ایک خط میں لکھا ہے کہ ''ایک نیا ظلم پرانے دشمن نے کیا یہ ہے کہ تھوڑی سی زمین مجھے والدہ سے ورثے میں ملی تھی وہ بھی زبردستی چھین لی گئی۔ اس اجل گرفتہ (فریزر) نے کہ جس کے قتل سے اب تک فتنہ بپا ہے اور جس کی روح ناپاک، جنات کی طرح

Scanned by CamScanner

دل چل ڈالے ہوئے ہے۔ اپنے مقتول ہونے سے ایک دن پہلے میری موروثی : میں پر
میرے نان یں کے لیے کافی تھی اور سرکار اندر پت میں تھی، ضبط کر لی۔" (۲۶) مالی اعتبار
سے مومن خاں کی حالت غالب خستہ سے بھی زیادہ خستہ تھی لیکن وہ ساری عمر عزت نفس اور خود
داری و وضع داری کے ساتھ نبھاتے رہے۔ بعض دفعہ اتنے پریشان ہوتے تھے کہ دہلی کو چھوڑ کر
چلے جانا چاہتے تھے جس کا اظہار اپنے خطوط میں کیا ہے۔ ایک خط بنام غلام حسین خاں میں
لکھا ہے کہ "اس اجڑے دیار میں جاہل اور بے قدر کافروں کے ہاتھ میں پڑ کر شرفا کی قدر کیمیا
کی خاصیت اور دولت و اقبال عنقا کا حکم رکھتا ہے، اس نظر سے سفر لکھنو کا ارادہ ہے۔ اگر وہاں
کاربراری ہوئی فبہا ورنہ اُس ملک کا ارادہ بھی دل میں ہے کیوں کہ اکثر لوگوں نے ارباب کمال
خصوصاً شعرا کے حق میں لالہ چندولال بہادر کی قدردانی کا ذکر کیا اور یہ ہیچ مداں اس باغ
کی خوشبو کے تصور سے مست ہے اگر حق تعالیٰ کو منظور ہے تو وہاں پہنچ کر دولت قدم بوسی سے
سعادت حاصل کروں گا اور لالہ صاحب مذکور کے والد کا ارتباط، ہمارے خاندان سے رہا ہے،
عرض کروں گا۔" (۲۷) اس مالی تنگی اور پریشان حالی نے مومن کے اندر ناقدری اور شکایت
زمانہ کے احساس کو جنم دیا۔ جس کا اظہار افتخار اور خود پسندی کی صورت میں اپنے خطوط اور فارسی
اردو شاعری میں کیا ہے:

منم کہ نیست قرائم بہیچ قرن و زمن
منم کہ نیست نظیرم بہیچ شہر و دیار
نبود و نیست عدیل من امتحاں اینک
ز زندگان لب و خامہ ز مردگاں اشعار (۲۸)

معاشی الجھنوں نے ناقدری و شکایت زمانہ کے احساس کو گہرا کر کے ان میں انگریز
دشمنی کے جذبے کو تیز تر کیا تھا اور وہ کاغذ و قلم کے کام سے بھی دست بردار ہو جانا چاہتے تھے۔
ایک خط بنام حکیم احسن اللہ خاں میں لکھا ہے کہ "میرے آئینہ پر کس مپرسی کی زنگار اس قدر جم گئی

Scanned by CamScanner

بے درم و دام خریدار بھی اس کو چاہا نہیں دے سکتا۔ میرے یوسف (کلام) کو بڑھیا کے سوت کی انٹی کے بدلے بھی لوگ نہیں خریدتے اور اس کو چاہ کنعاں سے کھوٹے سکوں کے عوض بھی نہیں نکالتے۔ ید بیضا کے بجھے کے باوجود میں خالی ہاتھ ہوں اور دم عیسیٰ کے ہوتے ہوئے بیماری میں مبتلا ہوں۔ یہ کاغذ و قلم کی زحمت بھی آپ کے تعمیل حکم میں ہے ورنہ نقد سخن کی بے قدری سے لکھنے پڑھنے کا دماغ کس کو ہے۔" (۲۸)

از علم بہ حکم از دلم بیروں باد
محزوں شدم از ہنر ہنر محزوں باد
از کاوش دانشم دلم پرخون است
یارب کہ دروں دانشم پر خوں باد

مومن نے اپنی شاعری کے بالکل ابتدائی زمانے میں اس وقت کے بڑے مشہور استاد شاہ نصیر دہلوی کو غزلیں دکھائیں مگر ان کا شعری مزاج شاہ نصیر سے مختلف تھا اس لیے جلد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ مومن کی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ بارہ تیرہ برس کے تھے۔ ۱۲۳۱ھ میں جب اپنی پہلی عشقیہ مثنوی "شکایت ستم" مکمل کی تو ان کی عمر سترہ برس کی تھی۔ یقیناً کچی پکی شاعری کا آغاز اس سے چند سال پہلے ہو گیا ہوگا۔ اس طرح ان کی شاعری کا آغاز ۱۲۲۷/۱۲۲۸ھ متعین کیا جا سکتا ہے۔ فائق رامپوری نے بھی ۱۲۲۷ھ آغاز شاعری کا سال متعین کیا ہے۔ (۳۰)

وفات سے پانچ مہینے پہلے صفر کے مہینے میں گھر کی چھت پڑ رہی تھی۔ مومن نگرانی کر رہے تھے کہ اچانک پیر پھسلا اور وہ بے طرح زمین پر آ رہے۔ ہاتھ اور بازوؤں کی ہڈیاں بری طرح ٹوٹ گئیں۔ علاج کیا لیکن افاقہ نہیں ہوا۔ زائچہ دیکھا تو کہا کہ میں صرف پانچ مہینے اور زندہ رہوں گا اور اس حادثے کی تاریخ "دست و بازو بشکست" (۱۲۶۸ھ) لکھوائی اور یہ قطعہ کہا:

Scanned by CamScanner

مومن فتاد از بام گفتم چہ رفت گفتا
خود باخروش گفتم بشکست دست و بازو
گفتم کہ بایدت گفت، تاریخ ایں مصیبت
گفتا خموش گفتم "بشکست دست و بازو" ۱۲۶۸ھ

یہی تاریخ حادثہ ان کی تاریخ وفات ثابت ہوئی۔ غالب نے اپنے ایک خط بنام منشی نبی بخش حقیر مورخہ یکم شعبان ۱۲۶۸ھ مطابق ۲۱ مئی ۱۸۵۲ء میں لکھا کہ "سنا ہوگا کہ مومن خاں مر گئے۔ ان کو مرے ہوئے دسواں دن ہے ..... مومن خاں میرا ہم عصر اور یار بھی تھا۔ بیتالیس تنتالیس برس ہوئے یعنی چودہ چودہ پندرہ پندرہ برس کی میری اور اس مرحوم کی عمر تھی۔ مجھ میں اس میں ربط پیدا ہوا۔ اس عرصے میں کبھی کسی طرح رنج و ملال درمیان نہ آیا ..... یہ شخص اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا۔ طبیعت اس کی معنی آفریں تھی۔ (۳۱) غالب کے اس خط کی رو سے یکم شعبان کو دسواں دن تھا یعنی ۲۱ رجب ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۲ مئی ۱۸۵۲ء کو مومن کی وفات ہوئی۔ یکم شعبان ۱۲۶۸ھ/۱۲ مئی ۱۸۵۲ء کو جمعہ کا دن تھا اور ۲۱ رجب کو چار شنبہ (بدھ) تھا۔ عرض گیاوی نے جمعہ کا دن بتایا ہے صحیح نہیں ہے۔ مومن خاں کی خواہش کے مطابق دلی دروازے کے باہر مہندیوں میں شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان کے مقابر کے احاطے کی دیوار کے باہر انہیں دفن کر دیا گیا۔ ان کی وفات کے ۹۵ سال بعد پروفیسر احمد علی دہلوی نے قبر کو پختہ کرا کے اس پر کتبہ لگوا دیا۔ کاش یہ شعر بھی لکھوا دیتے:

سنگ مرقد سے مرے فیض ہے سب کو مومن
ہوں نہ خاک بھی طوطی پسِ آئینہ

برسوں بعد جب احاطہ کی گری ہوئی دیوار دوبارہ بنائی گئی تو مومن کی قبر کو بھی اندر لے لیا گیا۔ ان کی وفات پر متعدد شعرا نے قطعات تاریخ لکھے۔ آگہی نے "ماتم مومن خان" سے سال وفات نکالا اور غالب نے یہ رباعی لکھ کر اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا۔

Scanned by CamScanner

قدرا است کہ روے دل ماتم ہمہ عمر
خوں باد بہ ہر زدہ ماتم ہمہ عمر
کافر ماتم اگر بہ مرگ مومن
چوں کعبہ سیہ پوش بہ ماتم ہمہ عمر

شاعری میں مومن کے بہت سے شاگرد تھے جن میں ۳۸ کے نام فائق رامپوری نے اور ۳۳ کے نام ظہیر احمد صدیقی نے اپنی کتاب میں دیے ہیں جن میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، حسرتی، نواب محمد اصغر علی خاں نسیم دہلوی، میر حسن تسکین، میر عبدالحق آہی، حکیم مولا بخش قلق میرٹھی، مرزا قربان علی بیگ سالک، مرزا محمود بیگ راحت دہلوی وغیرہ ممتاز ہیں۔ دیوان مومن کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۶ء میں شیفتہ نے مرتب کیا اور دوسرا ایڈیشن ۱۲۸۴ھ میں آگہی نے مرتب کیا مطبع نول کشور سے شائع ہوا۔

مومن مغلیہ سلطنت کے زوال اور انگریزوں کے تسلط سے انتہائی ناخوش تھے جس کا اظہار نہ صرف اپنے خطوط میں کیا ہے بلکہ متعدد اشعار میں بھی اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ "دیوان فارسی" میں عرفی کے قصیدے پر قصیدہ لکھا اس کے دو شعر یہ ہیں:

ایں عیسویاں بلب رسانند
جاں من و جان آفرینش
برخیز کہ شور کفر برخاست
اے فتنہ نشان آفرینش

جنگ کابل میں جب انگریزی فوج کا قافلہ افغان مجاہدوں نے تباہ کر دیا اور انہیں کابل چھوڑنا پڑا تو مومن نے دو قطعات تاریخ (۳۳) کہے جن سے ان کے دلی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

بہ ارباب ایماں در آویختند
زبس کافران ہزیمت نصیب

Scanned by CamScanner

برآورد سر مومن ما و گفت
کہ نصر" من اللہ فتح قریب ۱۲۹۶-۴۰=۱۲۵۶ھ
بخواری ز کابل بروں آمدند
چوں کفار ملعون ذلت قریں
ز روئے یورش سال تاریخ فتح
ملک گفت فضل علی المومنین

۱۲۵۴ھ=۱۶+۱۲۳۸ھ

جب مولانا محمد اسحٰق نے دارالحرب سے حرم کعبہ ہجرت کا عزم کیا تو چھ شعر کا قطعہ کہا جس کے دو شعر یہ ہیں۔

از کشور ہند رخت بربست
بیزار ز کافران اظلم
بگذاشتہ دارحرب امسال
جا کردہ بہ مکۂ معظم

"مثنوی جہادیہ" سے بھی مومن کے انداز فکر اور جذبہ جہاد پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ اپنے ذاتی مصائب اور قومی تباہی کو انگریزی تسلط و اقتدار کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ ایک نظام ٹوٹ رہا تھا اور ایک استعماری نظام اس کی جگہ لے رہا تھا۔ اسی کے ساتھ معاشی، معاشرتی و اخلاقی قدریں بدل رہی تھیں اور ہندوستانی علوم و فنون کی قدر و قیمت گھٹ رہی تھی۔ چاروں طرف بدحالی نے گھر کر لیا تھا اور اہل علم، اہل فن، اہل ہنر، امرا، نوابین اور پیشہ ور پریشان حال تھے۔ مومن کے اندر انگریزوں سے نفرت کا زہر بھرا ہوا تھا وہ انہی حالات کا نتیجہ تھا۔ ان میں ایسی خودداری و عزت نفس تھی کہ وہ غالب کی طرح کسی انگریز ملکہ یا کسی حاکم کی شان میں قصیدہ نہیں لکھ سکتے تھے۔ انھوں نے انہی میں حضرت صاحب سید احمد شہید

Scanned by CamScanner

بریلوی کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ، انیس سال کی تھی۔ کلب علی خاں فائق رامپوری نے تاریخ بیعت رجب ۱۲۳۴ھ اور ۲۰ شعبان ۱۲۳۴ھ مطابق ۱۸۱۹ء اور ۲۹ مئی ۱۸۱۹ء کے درمیان متعین کی ہے (۳۳)۔ مومن کو سید صاحب کی تحریک جہاد میں انگریزوں سے نجات کا راستہ اور امید کی کرن نظر آ رہی تھی۔ مثنوی جہادیہ کے علاوہ اردو شاعری میں بھی وہ تحریک جہاد سے اپنی وابستگی کا مسلسل اظہار کرتے رہے۔ ایک جگہ پر جہاد ان کے نزدیک عظمت رفتہ کو واپس لانے کا ذریعہ بن سکتا تھا۔

شوق بزم احمد و ذوق شہادت ہے مجھے

جلد مومن لے پہنچ اس مہدی دوراں تلک

زمانہ مہدی موعود کا پایا اگر مومن

تو سب سے پہلے کہیو تو سلام پاک حضرت کا

مومن کی شاعری پر اس جہادیہ تحریک کا گہرا اثر تھا۔ آج غزل کے رموز و کنایات میں یہ پہلو چھپ گیا ہے لیکن اس دور کے لوگوں کو یہ اشعار براہ راست متاثر کر رہے تھے۔

شخصیت کے دو روپ ہوتے ہیں۔ ایک ظاہری اور ایک باطنی۔ ظاہری روپ کسی شخص کے چہرے مہرے سے پیدا ہونے والے مجموعی تاثر سے ظاہر ہوتا ہے اور باطنی روپ اس شخص کی بات چیت اس کے طرز عمل، اس کے انداز فکر، اس کے ذہنی رویوں اور احساس جمال سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی تحریروں اور تخلیقی اظہار سے سامنے آتا ہے۔ ظاہری روپ پر باطنی روپ کی چھوٹ پڑتی ہے اور ظاہری روپ باطنی روپ کو سایہ فراہم کرتا ہے۔ مومن خاں کا ظاہری روپ تو وہ ہے اس لفظی تصویر سے ابھرتا ہے جس کا نقشہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے کھینچا ہے۔ (۳۵) اور دوسری طرح مومن کی اس واحد تصویر سے سامنے آتا ہے عرش گیاوی ''حیات مومن'' اور ضیا بدایونی کے مرتبہ ''دیوان مومن'' میں شامل ہے۔ تصویر کو دیکھ کر گہری سنجیدگی، رئیسانہ وضع قطع اور خوش پوشاکی کے ساتھ یہ تاثر بھی ابھرتا ہے کہ صاحب تصویر ایک

Scanned by CamScanner

خوب صورت وجیہ اور تندرست و توانا شخص ہے۔ سوالی شکل، آنکھیں اور لمبی لمبی گہری سوچ کا اشارہ ہیں۔ رنگ ہوائے آنکھوں سے مل کر اضطراب اور کرب کو ظاہر کر رہے ہیں۔ صاحب تصویر کے باطن میں طوفان برپا کیے ہوئے ہے۔ مومن کی شخصیت کی باطنی روپ ان کی نثری تحریروں اور ان کی شاعری سے سامنے آتا ہے۔ وہ حکیموں کے نامی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ فارغ البالی اور عزت و امیری انہیں ورثے میں ملی تھی لیکن انگریزی راج کے بعد اس خاندان کی جاگیر ان کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ ان ناانصافیوں کا اثر انگریزوں سے نفرت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جس کا اظہار انھوں نے اپنے فارسی خطوط اور فارسی و اردو شاعری میں کیا ہے۔ ورثے میں ملی ہوئی وضع داری، خاندان کی بڑائی کا احساس اور جاگیردارانہ دور کی قدروں کی پاس داری مومن کا سرمایہ حیات تھی۔ ان کی خود پسندی اسی طرز فکر کا نتیجہ تھی۔ اسی غیرت و خودداری کے باعث انھوں نے کسی کی نوکری نہیں کی اور کسی امیر، نواب یا بادشاہ کی مدح میں قصیدہ نہیں لکھا۔ ان کے کلام میں دو قصیدے ملتے ہیں ان میں سے ایک میں رئیس پٹیالہ راجا اجیت سنگھ کا شکریہ ادا کیا ہے جس نے انہیں ہاتھی کا تحفہ دیا تھا۔ اس قصیدے میں بھی راجا کی مدح و شکریہ ادا کرنے کے ساتھ اپنی بڑائی کا اظہار بھی کیا ہے۔

شاعر بے نظیر ہوں سحر بیاں دبیر ہوں
دم ہے مرا نمونۂ معجزۂ پیمبری
سحر حلال سے مرے جادوئے سامری خجل
طور کلیم اوج فکر، نور خدا فسوں گری
میری زبان میں وہ بات جس سے ملک سخن پرست
میرے بیان میں وہ سحر جس سے جنوں زدہ پری

اور ایک قصیدے میں والی ٹونک نواب محمد وزیر خاں کی مدح کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر نہ ہونے پر معذرت کی ہے حتیٰ کہ نعتیہ قصیدہ میں بھی سلیقے سے اپنی بڑائی کا اظہار کیا ہے۔

Scanned by CamScanner

مٹے ہیں خاک میں کیا کیا مرے فنون و علوم
خدا کسی کو نہ دے ایسے طالع منکوس
حکیم وہ ہوں کہ جاتے رہیں حواس اگر
کرے معارضہ سر دفتر عقول و نفوس
کروں گردش انجم کی میں رصد بندی
فدا ہو وجد میں آ کر روان بطلیموس

اس انداز فکر سے ان کے اندر ناقدری زمانہ کا شدید احساس محرومی پیدا ہوا جس کا اظہار وہ اپنی شاعری اور اپنے خطوط میں بار بار کرتے ہیں۔ ایک خط بنام احسن اللہ خاں میں لکھتے ہیں کہ ''المختصر میں اس طرح نغمہ سرائی کرتا ہوں کہ بلبل بھی میری ہم سری نہیں کر سکتی اور گل افشانیاں کرتا ہوں کہ زر گل ان کی حسرت میں جلتا ہے لیکن کیا کروں کہ سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھیں نہیں۔'' (۳۶) ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ ''زمانے کی ناقدری اور نافہمی کے باعث کوئی مرا خریدار نہیں ہے اور میرے آب دار موتیوں کا تاریکی میں بھی بازار مندا ہے..... اس ناقدری کے باوجود میں نے کبھی ہنر کی آبرو نہیں بیچی اور امراء کی آستین سے توقعات وابستہ نہیں کیں۔ میں نے جَو کی روٹی پر قناعت کی ہے اور آسمان کے خوشہ گندم پر کبھی نظر نہیں ڈالی ..... اور یہ کاغذ و قلم کی زحمت بھی آپ کے تعمیل حکم میں ہے ورنہ نقد سخن کی بے قدری سے لکھنے پڑھنے کا دماغ کس کو ہے۔'' (۳۷) اسی کشمکش سے ان کی ساری زندگی عبارت ہے۔ اس سطح پر انھوں نے حالات زمانہ سے کبھی سمجھوتا نہیں کیا اور اسی وجہ سے ان کے مسودات منتشر پڑے رہے اور ان کا اردو دیوان مصطفےٰ خاں شیفتہ اور پھر عبدالرحمٰن آہی نے اور خطوط و فارسی کلام حکیم احسن اللہ خاں نے مرتب و شائع کیا۔

مومن عاشق مزاج و رنگین طبع انسان تھے۔ نو سال کی عمر سے اکتیس سال کی عمر تک وہ مختلف عشقوں میں گرفتار رہے جس کا اظہار انہوں نے اپنی چھ عشقیہ مثنویوں میں کیا ہے۔ یہ عشق

Scanned by CamScanner

وصل کا پجاری ہے اور جسم کی آگ بجھانے کا وسیلہ ہے۔ اس میں دو اتنے بدنام تھے کہ والد نے اپنی زندگی میں ان کی شادی نہیں کی اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے اور سب کے چہیتے تھے۔ انکی شاعری اور بالخصوص عشقیہ مثنویاں ان کی زندگی کی ترجمان ہیں۔ یہی عشق ان کی شاعری کو روشن کرتا ہے جس کے رنگارنگ تجربوں کا اظہار انھوں نے اپنی غزلوں میں کیا ہے۔ مثنوی "قصہ غم" (۱۲۳۵ھ) میں مومن نے اپنے رنگ مزاج کا تعارف اس طرح کرایا ہے۔

تھا نام تو مومن اور دیں کفر
جاں محو بتاں و دل نشیں کفر
رسوائے زماں و تیرہ ایام
آوارہ و ہرزہ گرد و بدنام
ربط اس کو بتان نازنیں سے
دنیا سے نہ کام کچھ، نہ دیں سے
مدہوش شراب نوانی
سرشار نشاط و شادمانی
آرام و طرب میں صرف اوقات
مشغول سرور و عیش دن رات
ں غنچہ سدا کھلے ہی جانا
ہر وقت ہر آن مسکرانا
دیوانوں سے شوق بے نہایت
اشعار کا ذوق بے نہایت
تصحیح سخن پہ طبع مائل
علم شعرا میں فرد کامل

Scanned by CamScanner

بے بذلہ تھی نہ بات کوئی
ختم اس پہ ہوئی لطیفہ گوئی
ہر بڈ و اس سے آشنائی
سارے ہی جہاں سے آشنائی

مومن اس دور کے طبقہ خواص سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنی شاعری میں بھی ... سے مخاطب ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ''ابھی میں زندہ ہوں اور بہت کچھ لکھوں گا ... ہے اور اس کی گواہی کافی ہے کہ امسال بھی بہت سے مکاتیب پر دقلم کیے گئے لیکن ... کے مضامین نازک روزمرہ عوام میں بیان کیے گئے اس لیے ان کی نقل کی میں نے ... اگر مجھے یقین ہوتا کہ آپ گدھے گھوڑے کے ساتھ یکساں سلوک کریں گے تو ... بھیج دیتا۔'' (۳۸)

مومن کی شخصیت اور مزاج کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہل چل مچا دینے ... اضطراب ان کے مزاج کا جزو اعظم تھا۔

ہجر بتاں میں تجھ کو ہے مومن تلاش زہر
غم پر حرام خوار توکل نہ ہو سکا

یہی وہ تخلیقی کرب ہے ان کی شاعری کا جوہر ہے۔ اسی سے ان کی شخصیت کا باطن روشن تھا جس کا اظہار ایک خط میں اس طرح کیا ہے کہ ''پہلا ظلم اس بے رحم (آسمان) نے مجھ پر کیا یہ ہے کہ میرے ضمیر کو دل سوختہ اور جگر برشتہ کی خاک سے آمیختہ کیا اور جس دن میرا قالب تیار کیا تو اس میں شورِ محبت کو ملا دیا۔ خدا کی شان جس نے کبھی جفا نہ دیکھی تھی اس نے جفائیں برداشت کیں اور جس نے کبھی ستم نہ سہے اس نے ستم اٹھائے۔'' (۳۹) اس اندازِ نظر نے ایک ایسے احساسِ برتری کو جنم دیا کہ وہ اپنی ذات کے حصار سے نہ نکل سکے اور اسی لیے خوشامد سے بھی دور رہے۔ ان کے دوسرے بڑے معاصر مرزا غالب اس سے نہ بچ سکے۔ غالب نے

خطوط سربرآوردہ شخصیات کو لکھے یا درخواستیں انگریزی سرکار میں بھیجیں یا قصائد ملکہ وکٹوریہ اور حکمران بالا کی مدح میں لکھے ان میں زمانہ سازی و خوشامد شامل ہے لیکن مومن نے کبھی یہ نہیں کیا۔ فریزر نے ان کی والدہ والی زمین ان سے چھین لی لیکن مومن نے کوئی درخواست اس سلسلے میں نہیں دی۔ انھوں نے مال دار سسرال کو ٹھکرا دیا اور شیخ ضامن کرم کو لکھا۔

"مانا کہ میں خاک میں مل گیا ہوں لیکن اب بھی آسمان کی ہم سری کو ننگ سمجھتا ہوں اور اگرچہ بے سروسامان ہوں لیکن سفلوں کی خوشامد کو اپنے رتبے سے فروتر خیال کرتا ہوں۔" (۴۰) اسی لیے مومن صاف گو انسان تھے۔ مصلحت اور کینہ و حسد سے ان کا دل پاک تھا۔ انہوں نے کبھی کسی کی ہجو نہیں لکھی اور نہ اپنی ذاتی و خاندانی شرافت سے دور ہوئے۔ ایک خط میں یہ شعر لکھ کر اپنے مزاج اور اپنے رسم و آئین کا اظہار کیا ہے۔

کفر است در طریقت ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن

مومن کی زندگی میں مذہب بڑی اہمیت رکھتا ہے لیکن ساتھ ہی عشق کی رنگینی اور آرزوئے وصل کی آگ بھی روشن ہے۔ وہ دونوں کو ساتھ لے کر چلتے اور ایک کو دوسرے پر قربان نہیں کرتے۔ جب والی ٹونک نے انھیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی اور حج پر بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا تو انھوں نے معذرت کے ساتھ تشکر کا اظہار کرتے ہوئے اس قصیدے میں یہ بھی لکھا کہ مجھے اس کے در کا شوق افزوں ضرور ہے:

پر کروں کیا بن نہیں آتی
ورنہ میں اور تیرہ پیمانی
سوچ سوچ اپنے دل میں ڈرتا ہوں
گو ہوں وسواس ہائے شیطانی
ہے ابھی آرزوئے وصل صنم
ہے ابھی حسرت ہوس رانی

Scanned by CamScanner

قر انجام سے راہ ہوئی
سن چکا ہوں حدیث صنعانی
بعد یک چند گر خدا چاہے
میں ہوں اور تیرے در کی دربانی

انہی میں وہ سید احمد شہید بریلوی سے بیعت ہو کر تحریک جہاد میں ذہنی طور پر شریک ہو گئے تھے جس کا اظہار ان کی شاعری اور خطوط سے ہوتا ہے۔ ایک مثنوی "جہاد" کے موضوع پر ان کے کلیات میں ملتی ہے۔ عقائد کے سلسلے میں وہ بہت کٹر تھے۔ فضل حق خیر آبادی سے اسی پر سے اختلاف ہوا۔ جس کا اظہار اس شعر سے بھی ہوتا ہے۔

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

جب جسم کی آگ ٹھنڈی پڑی اور مومن اپنے بال بچوں میں پھنس گئے تو یہ رنگین عشق بھی کم ہو گیا اور مذہبی رنگ گہرا ہو گیا مرتے دم تک ان کے ساتھ رہا۔

مومن جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں۔ خوب صورت و وجیہہ جوان تھے۔ انہیں خاندانی عظمت کے ساتھ اپنے حسین و جمیل ہونے کا بھی شدید احساس تھا۔ وہ عاشق بھی ہیں تو معشوق مزاج ہیں۔ ایک خط میں خود بھی لکھا ہے کہ "عاشق معشوقانہ مزاجم و باصد نیاز مند بیجا احتیاج۔ عاشق وفا شعارم اما غیرت مند و بندہ حق گزارم الا خریدار پسند" اسی مزاج کی وجہ سے ان کا عشق یک طرفہ نہیں ہوتا۔ معشوق بھی عشق میں مبتلا ہو اور عاشق بھی۔ عاشق و معشوق دونوں ایک ساتھ ایک دوسرے پر عاشق ہوں اور دونوں ایک دوسرے کے لیے معشوق بھی ہوں۔

معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری
واں لطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا

Scanned by CamScanner

ہیں اسیر اس کے ہے اپنا اسیر
ہم نہ سمجھے صید کیا صیاد کیا

یہی وہ عشق ہے کامیابی سے چل سکتا تھا۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ دونوں کے جذبے اور ذہن کی سطح ایک ہو اس لیے ممکن نہیں تھی کہ معشوقانہ مزاج والے عاشق مومن خاں غیر معمولی احساس اور ذہن کے مالک تھے اسی لیے ان کے زیادہ تر عشق ناکامی سے ہم کنار ہوئے اور اگر مومن کی کسی کے ساتھ کوئی ذہنی سطح بنی بھی تو وہ امتہ الفاطمہ صاحب تھی پہلے مومن پر عاشق ہوئی اور پھر مومن نبض دیکھتے ہوئے اس پر عاشق ہوئے۔ اب دونوں ایک دوسرے کے عاشق بھی تھے اور ایک دوسرے کے معشوق بھی۔ عشق کا یہی رنگ ان کی شاعری میں رنگ بھرتا ہے اور اسی وجہ سے مومن کا عشق اردو شاعری کے روایتی تصور عشق سے قدرے الگ ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "ہاں اگر مجھے کسی چیز کی طمع ہے تو وہ یک دلی اور یکتائی ہے اگر میں کوئی چیز گننے کے قابل سمجھتا ہوں تو وہ جنس محبت و آشنائی ہے۔" (۴۱)

رنگا رنگی ان کے مزاج میں شامل تھی۔ وہ نجوم و رمل پر پوری قدرت رکھتے تھے اور ان کے کئی قصے مشہور تھے۔ ایک وہ چھپکلی والا واقعہ کہ انہوں نے اپنے شاگرد سکھانند سے کہا کہ "یہ چھپکلی دیوار پر نظر آ رہی ہے اس وقت تک اپنی جگہ سے نہیں ہلے گی جب تک پورب کی طرف سے اس کا ژانہ آ جائے۔ ابھی وہ بات کر ہی رہے تھے کہ بنارس کا سوداگر کپڑوں کے دو گٹھے لے کر آیا۔ گٹھری مزدور کے سر سے اتاری ہی تھی کہ پٹ سے ایک چھپکلی نیچے گری اور دوڑ کر سامنے کی دیوار پر چڑھ کر اس سے آ ملی اور دونوں مل کر ایک طرف چلی گئیں۔" (۴۲) "آب حیات" میں آیا ہے کہ ایک غریب ہندو بے قرار و پریشان مومن خاں کے پاس آیا اور کہا کہ اس کے زیوروں کا ڈبا چوری ہو گیا ہے۔ ساری عمر کی کمائی لٹ گئی۔ مومن خاں نے اس سے کئی سوال کیے اور کہا کہ یہ ڈبا تم نے لیا ہے یا تمہاری بیوی نے۔ باہر سے کوئی نہیں آیا اور کہا جا کر جنوب کے رخ پر کوٹھری ہے اس میں شمال کی جانب ایک لکڑی کا مچان ہے اس کے اوپر مال مو د

Scanned by CamScanner

ہے۔ اس نے کہا حضور تین دفعہ چھان پھٹک مارا۔ کہا کہ پھر دیکھو وہیں سے گا۔ وہ پھر گیا، روشن
میں دیکھا تو وہ ڈبا اور سارا زیور سو دتھا۔" (۴۳) شطرنج ان کا شوق تھا۔ عملیات سے بھی دلچسپی
رکھتے تھے۔ علم ریاضی پر قدرت تھی۔ ہر سال تقویم تیار کرتے اور سال بھر اسی سے
حالات کے بارے میں پیشن گوئیاں کرتے رہتے۔ کسی نے ایسے بہت سے واقعات
کر بھوائے تھے جنہیں وہ اس لیے شامل تذکرہ نہ کر سکے کہ لوگ اعتراض کریں گے کہ "تذکرہ
شعرا لکھنے بیٹھا اور نجومیوں کا تذکرہ لکھنے لگا۔" (۴۴)

شاعری کے معاملے میں وہ حد درجہ سنجیدہ تھے۔ ایک خاتون کو اپنی غزل بھجوائی اس
نے اپنا خط میں لکھا کہ "یہ غزل آپ نے تفریح مزاج کے طور پر لکھی ہے۔ مومن برا مان گئے۔
لکھا کہ "اگر پسند ہو تو کاتب الحروف سے نئی غزلیں لکھوا کر بھیجوں۔ الٰہی یا وہ گویوں کی بات
کا کیا اب دوں۔ اس غزل سے اور تفریح سے کیا علاقہ ---- آئندہ زحمت نہ دیں کہ مجھے اس
قدر دماغ نہیں۔" (۴۵)

مومن کو اپنی ذات اور اپنی شاعری دونوں پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ اپنے خطوط میں،
خصوصاً وہ خط انھوں نے اپنے پھوپھی زاد بھائی حکیم احسن اللہ خاں کو لکھے ہیں، اپنے فن، اپنی
زبان، اپنی فصاحت و بلاغت کے بارے میں بلا تکلف لکھتے ہیں کہ:

بحکم نادرہ نحی یگانہ دہرم
نہ کس بہ نظم عدیلم نہ کس بہ نثاری

(ندرت کلام کے لحاظ سے میں زمانے میں یکتا ہوں اور نہ کوئی نظم میں میرا ہم سر ہے اور نہ نثر میں) (۴۶)
اسی مزاج سے مومن کا تخلیقی عمل تشکیل پاتا ہے۔ وہ مضامین خیالی سے دامن بچاتے ہیں اور اپنے
تجربوں کے نور سے اپنی شاعری کے در و دیوار روشن کرتے ہیں۔ حکیم احسن اللہ خاں نے مومن
خان کو لکھا کہ وہ مضامین خیالی لکھ کر پیش کریں۔ مومن خاں نے اب دیا کہ "مضامین خیالی لکھ
کر پیش کروں یہ مناسب نہیں کیوں کہ سخن سازی ارباب صدق و صفا کا شیوہ نہیں۔" (۴۷) یہی

Scanned by CamScanner

انداز نظر مومن کے تخلیقی عمل کا حصہ ہے جس کا اظہار ایک اور خط میں وضاحت کے ساتھ کیا ہے:

''نکتہ شناس جانتے ہیں کہ اطمینان خاطر کے بغیر دل نشین نکتے نہیں سوجھتے اور عالی نظر سمجھتے ہیں کہ کافی غور کے بغیر شاید معنی کا چہرہ (چشم آفتاب ہی کیوں نہ ہو) دکھائی نہیں دیتا۔ بے تکلفی کی حالت میں شاعرانہ تکلف بن نہیں پڑتا اور انتشار خیال کے عالم میں نادر مضامین نہیں سوجھتے۔ جب تک شاعر محو حیرت نہ ہو اس وقت تک الفاظ کی صفائی بغیر کسی وقت کے میسر نہیں ہوتی اور جب تک وہ اپنی خودی نہیں کھوتا زبان سخن گوئی پر اور سخن زبان پر نہیں آتا۔ اگر آپ تجاہل عارفانہ سے کام نہ لیں، تقلیب اور حسن تعلیل کی طرف توجہ نہ دیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مضامین کے ابہرات کا جڑنا کس قدر دشوار ہے اور سپیدی و سیاہی کا تقابل کتنا مشکل ہے۔'' (۴۸)

مومن کا یہ وہ تخلیقی رویہ ہے ان کی ساری شاعری میں رچا بسا ہے۔ وہ شعر غور و فکر سے کہتے ہیں جس میں مضامین خیالی کے بجائے ان کے اپنے تجربات رنگ بھرتے ہیں۔ ان کے زاویہ نظر کے مطابق شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ محو حیرت ہو۔ اسی سے خیال لفظوں کی گرفت میں آتا ہے۔ اس عمل میں اسے اپنی خودی کو مٹانا پڑتا ہے اور وہ معیار شاعری و د میں آتا ہے جس میں ''کنایت'' صراحت پر غالب رہتی ہے۔ بیٹے کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ چوں کہ مجھ کو ''شعر و شاعری سے ذوق ہے اس لیے کنایت کو صراحت سے بہتر سمجھتا ہوں۔'' (۴۹) اسی وجہ سے ''محذوفات'' ان کی شاعری کا عام مزاج ہے۔ وہ شاعری عوام کے لیے نہیں بلکہ خواص کے لیے کرتے ہیں اور اسی لیے کنایات و محذوفات کو سمجھنے، انہیں تلاش کر کے خیال کو پورا کرنے کے عمل میں وہ اپنے قاری کو شریک کرتے ہیں۔ ان کی شاعری اسی لیے مشکل پسند ہے اور دوسرے معاصرین سے مزاجاً مختلف اور منفرد ہے۔

Scanned by CamScanner

حوالہ جات

۱۔ کلیات مومن (جلد دوم) مرتبہ کلب علی خاں فائق، ص ۱۱۰۔۱۱۱، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء

۲۔ مومن خاں کے پھوپھی زاد بھائی اور اس دور کی مشہور شخصیت حکیم احسن اللہ خاں نے "انشائے مومن" کے مقدمہ میں ان کا پورا نام محمد مومن خاں لکھا ہے۔ دیکھیے انشائے مومن مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ص ۲۲، غالب اکیڈمی نئی دہلی ۱۹۷۷ء، اور دیوان مومن مرتبہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، مطبوعہ دہلی، ۱۸۴۶ء کے دیباچے میں بھی شیفتہ نے پورا نام محمد مومن خاں دیا ہے۔ دیکھیے کلیات مومن جلد اول مرتبہ کلب علی خاں فائق، ص ۵۶، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء

۳۔ کلیات مومن (جلد اوّل) مرتبہ کلب علی خاں فائق، ص ۶۰، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء

۴۔ حیات مومن، ضمیر الدین عرش گیاوی، ص ۳۷، دہلی ۱۳۳۷ھ

۵۔ عمدہ منتخبہ، اعظم الدولہ سرور، ص ۶۵۱، دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۱ء

۶۔ گلشن بے خار، مصطفیٰ خاں شیفتہ، بار دوم، ص ۱۹۶، مطبع نول کشور لکھنو ۱۹۱۰ء

۷۔ گلستان سخن، مرزا قادر بخش صابر دہلوی، حصہ دوم، ص ۳۸۹، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶ء

۸۔ عمدہ منتخبہ، محولہ بالا، ص ۶۵۱

۹۔ حیات مومن، ص ۳۷، محولہ بالا

۱۰۔ خوش معرکہ زیبا، سعادت خاں ناصر، جلد دوم، مرتبہ مشفق خواجہ، ص ۱۶۹، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۲ء

Scanned by CamScanner

۱۱۔ انشائے مومن، مومن خاں مومن، مرتبہ و مترجمہ ظہیر احمد صدیقی، ص ۳۷۱، غالب اکیڈمی نئی دہلی، ۱۹۷۷ء

۱۲۔ ایضاً ص ۳۷۹

۱۳۔ سخن شعراء، عبدالغفور خاں نساخ، ص ۳۹۷، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۶ء

۱۴۔ انشائے مومن، محولہ بالا، ص ۱۶۰ فارسی و ترجمہ ص ۳۸۹، دہلی یونیورسٹی ۱۹۷۷ء

۱۵۔ دیوان مومن (فارسی) مخطوطہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ اس کے لیے میں ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کا شکر گزار ہوں۔

۱۶۔ انشائے مومن، محولہ بالا، ص ۲۸۳

۱۷۔ ایضاً ص ۲۸۲

۱۸۔ ایضاً ص ۲۸۳

۱۹۔ مرغ = ۱۲۴۰ + قفس = ۲۴۰ یعنی کل ۱۴۸۰ میں سے بال کے ۳۳ اور پر کے ۲۰۲ کل ۲۳۵ نکال دیے جائیں تو ۱۲۴۵ھ برآمد ہوتے ہیں۔

۲۰۔ دیکھیے شجرہ خاندان مومن، ص ۱۱۶۔۱۱۷، مومن شخصیت اور فن، ظہیر احمد صدیقی، دہلی یونیورسٹی ۱۹۷۲ء

۲۱۔ انشائے مومن، محولہ بالا، ص ۲۲۹

۲۲۔ ایضاً ص ۲۳۳

۲۳۔ کلیات مومن، مرتبہ کلب علی خاں فائق، (جلد دوم) ص ۲۸۲، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۴ء

۲۴۔ انشائے مومن، محولہ بالا، ص ۳۴۳

۲۵۔ ایضاً ص ۳۹۲

۲۶۔ ایضاً ص ۲۲۵

Scanned by CamScanner

۲۷۔ انشائے مومن بحوالہ بالا، ص ۲۱۹

۲۸۔ ایضاً ص ۲۱

۲۹۔ ایضاً ص ۲۲۲

۳۰۔ مومن اور کلب علی خان فائق، ص ۲۰۷، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۹۱ء

۳۱۔ جواہرات غالب، آفاق حسین، ص ۱۲، ادارہ نوادرات کراچی

۳۲۔ جنتری صد سالہ انجمن اسلامیہ، ص ۳۰۹، [illegible]

۳۳۔ مومن، کلب علی خان فائق، ص ۷۱، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۹۱ء

۳۴۔ ایضاً ص ۷۱

۳۵۔ دلی کا ایک یادگار مشاعرہ، مرزا فرحت اللہ بیگ، ص ۳۵_۳۶، اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۰ء

۳۶۔ انشائے مومن بحوالہ بالا، ص فارسی ۵۸، اردو ترجمہ ص ۲۵۳

۳۷۔ ایضاً ص فارسی ۳۶_۳۷، اردو ترجمہ ص ۲۲۳

۳۸۔ ایضاً ص اردو ۳۸۰، فارسی ص ۱۵۳

۳۹۔ ایضاً ص اردو ۳۸۰، فارسی ص ۱۵۳

۴۰۔ ایضاً ص اردو ۳۸۳، فارسی ص ۸۱

۴۱۔ ایضاً بحوالہ بالا، ص اردو ۲۳۸

۴۲۔ دلی کا ایک یادگار مشاعرہ، مرزا فرحت اللہ بیگ، ص ۳۵_۳۶، اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۰ء

۴۳۔ آب حیات، محمد حسین آزاد، ص ۳۲۲_۳۲۳، آزاد بک ڈپو لاہور، س۔ن

۴۴۔ ایضاً ص ۳۲۳

۴۵۔ انشائے مومن بحوالہ بالا، ص اردو ۳۶۹، فارسی ص ۲۵۳

۴۶۔ انشائے مومن، بحولہ بالا، فارسی شعر ص ۳۶، اردو ترجمہ ص ۲۲۳

۴۷۔ ایضاً، فارسی ص ۴۰، اردو ترجمہ ص ۲۲۹

۴۸۔ ایضاً بحولہ بالا، اردو ترجمہ ص ۲۳۱۔۲۳۲، فارسی ص ۴۲

۴۹۔ ایضاً بحولہ بالا، اردو ترجمہ ص ۲۶۸، فارسی ص ۶۹

Scanned by CamScanner

حکیم مومن خاں مومن

Scanned by CamScanner

ڈاکٹر نجمہ کاشمیری

سن ستاون کی دلّی

It was the morning of 11th May, 1857 when the rebel forces from Meeruth crossed the Jumna boat bridge, enter in the city and marched towards the red fort. The King of Delhi Bahadur Shah was enjoying the horison while sitting in the musamman burj. The rebel forces forcefully entered in the fort and reached in the Diwan-e-Aam. They explained the causes of rebellion and requested the King for his patronization which half heartedly under their unbearable pressure. This paper reveals the story of Delhi in 1857. Delhi was a peaceful city till 10th May 1857. The people were enjoying their life under the symbolic kingship of Bahadur Shah. The city was in the firm control of East India Company. But on the 11th May Delhi became a centre of the revolutionary forces who were coming from all parts of India and they were steadily growing in large numbers. This paper tells the story of the revolution from its earliest days to its last days of September 1857. The present study has focused the

Scanned by CamScanner

day to day struggle of the freedom fighters. In the second week of September the British army received military help. They made a strong offence, defeated the freedom fighters, captured the city, imprisioned the King and destroyed the city and the civilians. The present study is based on the contemporary sources.

۱۰۔ مئی ۱۸۵۷ء کا دن دلی میں معمول کے مطابق گزرا تھا۔ شہر کی زندگی روزمرہ کے دستور کے مطابق رواں دواں رہی تھی۔ دلی بنک کاروبار کے لیے وقت پر کھلا اور بند ہوا تھا۔ شہر کی خبروں اور سرکاری احکامات پر مشتمل "دلی گزٹ" صبح کے وقت حسب معمول شائع ہوا تھا۔ دلی کی کچہری اپنے اوقات کار میں مصروف رہی تھی۔ دلی کے شمال میں دھیرج پہاڑی (The Ridge) پر دیسی پلٹنوں اور انگریز افسروں کی پریڈ قاعدے کے مطابق ہوئی تھی اور وہاں فوجی بینڈ بجتے رہے تھے۔

جیمس سکنر (James Skinner) کے بنائے ہوئے سینٹ جیمس چرچ (St.James Church) میں شہر کی کرسچین آبادی دستور کے مطابق ہفتہ وار عبادت کی رسوم ادا کرنے کے لیے حاضر ہوئی تھی۔ اس موقع پر ان کے ساتھ بچے اور خواتین بھی آتی تھیں اور اس طرح سے یہ چرچ ان کے سماجی میل ملاپ اور گپ شپ کا ذریعہ بھی بن گیا تھا۔

سرشام دلی کلب حسب معمول پر رونق ہونے لگا تھا۔ دن بھر کی لو اور گرمی سے تھکے ماندے یورپین کلب میں داخل ہونے لگے تھے ان لوگوں کے لیے دلی کلب کی بغ بستہ بیئر (Bear) شادمانی کا ایک بڑا ذریعہ تھی۔ تاش یا شطرنج کھیلتے، دلی کی زندگی کے مسائل پر بات چیت کرتے، کلکتہ، بیرک پور اور برہام پور کی فوجی ہلچل پر تشویش اور کارتوسوں کے مسئلے پر

Scanned by CamScanner

دیسی فوجیوں کا مزاج اڑاتے ہوئے یہ لوگ اس رات کے کھانے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو لوٹے تھے۔

یہ اتوار کا دن تھا اس لیے دلی شہر کی جدید درس گاہ "دلی کالج" میں ہفتہ وار تعطیل تھی۔ طلبہ اور اساتذہ اپنے اپنے گھروں میں آرام کرنے یا درسی تیاریوں میں مصروف رہے تھے۔ شہر کی عدالتیں اور سرکاری دفتر بند تھے، اسی لیے اس صبح مٹیا محل کی سڑک سے مفتی صدرالدین آزردہ کی حویلی سے ان کی فٹن برآمد نہ ہوئی تھی۔ اس صبح مفتی صاحب نے سحری کھانے کے بعد نماز ادا کی اور پھر معمول کے وظائف کے بعد استراحت کر رہے تھے۔ لال قلعہ کے روز و شب دستور کے مطابق بسر ہو رہے تھے۔ بادشاہ تخت پر بیٹھتا تھا۔ عدالت کا دربار لگتا تھا۔ امیر، وزیر، بخشی، ناظر، وکیل، میر عدل، میر منشی، محرر، مصدی وغیرہ ہاتھ باندھے کھڑے نظر آتے تھے۔ اپنے اپنے محکموں کے کاغذات پیش کرتے تھے۔ میر عدل دارالانصاف کے مقدمے پیش کر رہا تھا۔ عرض بیگی دادخواہوں کی عرضیاں حضور میں گزار رہا تھا۔ حکم احکام جاری ہو رہے تھے۔ دارالانشاء سے کسی کے نام شقہ، کسی کو فرمان لکھا جاتا تھا۔ (۲)

چوں کہ یہ رمضان کا مہینہ تھا اس لیے دن کے اوقات میں دکانوں کی رونق کم کم تھی۔ سہ پہر کے بعد جب سورج کے سائے لمبے ہونے لگے تو دلی کے خاص خاص بازاروں میں چھڑکاؤ گاڑیاں آہستہ آہستہ چھڑکاؤ کر کے زمین کے جھلسے ہوئے سینے کو ٹھنڈا کر رہی تھیں۔ دکانیں کھل چکی تھیں۔ بازار آباد ہوتے جا رہے تھے۔ چاندنی چوک میں گہما گہمی کا آغاز تھا۔ پالکیاں آ جا رہی تھیں۔ گھوڑ سوار دکانوں کی سیر کرتے ہوئے آہستہ آہستہ گزر رہے تھے۔ جوہریوں، کپڑا فروشوں اور بناؤ سنگھار والوں کی دکانیں جگمگانے والی تھیں۔ جمنا کے پل کی طرف بڑھتے ہوئے قافلے شام ہونے سے پہلے پہلے شہر میں داخل ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ شہر کے گنبد اور بلند مینار ڈوبتے ہوئے سورج کی نارنجی کرنوں سے چمکنے لگے تھے اور شفق پہ دور تک نارنجی روشنی کا غبار پھیلتا چلا گیا تھا۔

Scanned by CamScanner

غروب آفتاب کے بعد افطاری کی توپ چلنے سے کچھ پہلے لال قلعہ سے خدام شاہی
خوانوں پر افطاری کے بڑے بڑے خوان اٹھائے جامع مسجد کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہے تھے
اور شہر بھر بالخصوص قلعہ سے افطاری آ گئی۔ روزہ داروں کے لیے یہ شاہی تبرک من و سلویٰ سے
کم نہ تھا۔ مئی کا مہینہ تھا۔ شدید گرمی پڑ رہی تھی اور روزہ داروں کے حلق میں کانٹے محسوس ہو
رہے تھے۔ اس امتحان میں روزہ دار ایک ایک پل گن گن کر کاٹ رہے تھے۔ کوری کوری
جھجریاں، صراحیاں، گلابی آبخورے اور پیالے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر رکھے ہوئے
تھے۔ انگور، انار، فالسے اور دیگر میووں کے شربت گلاسوں میں رکھے گئے تھے۔ بادام پستوں کے
نقل، چھوارے، کشمش وغیرہ طشتریوں میں تھے۔ (۳) بیسنی، روغنی میٹھی روٹیاں اور کچے
ٹکڑوں میں لگ رہے تھے۔ حسینی کباب اور تکے تیار کیے جا رہے تھے۔ (۴)

سورج غروب ہونے کی اطلاع ملنے پر روزہ افطار کرنے کا وقت ہوا۔ بادشاہ نے
توپ چلانے کا حکم دیا۔ ہرکاروں نے جھنڈیاں ہلائیں اور دعائیں کی آواز بلند ہوئی۔ کھجوروں یا چھواروں سے روزہ کھولا گیا۔ شربت پیے گئے اور میوے چکھے گئے۔ (۵)

۱۰۔ مئی کی رات بھی دلی شہر میں حسب معمول تھی۔ عشاء کی نماز کے بعد شہر کی مساجد تراویح پڑھنے والوں سے پر رونق تھیں۔ لال قلعہ میں دیوان خاص کے اندر بادشاہ نے باجماعت نماز ادا کی۔ ڈیڑھ پارہ قرآن شریف کا تراویح میں سنا۔ پھر بیٹھک میں تشریف لائے۔ کچھ بات چیت کی۔ بھنڈا نوش کر کے پلنگ پر آرام کیا۔ ڈیڑھ پہر رات باقی رہی تو محل شاہی، نقار خانے اور جامع مسجد میں سحری کا پہلا ڈنکا سنائی دیا۔ سحری کے خاصے کی تیاری شروع ہوئی۔ دوسرے ڈنکے پر دستر خوان پر طعام چنے گئے اور تیسرے ڈنکے پر بادشاہ نے سحری کا خاصہ کھایا اور بھنڈا نوش کیا۔ پھر صبح کی توپ چلی اور کھانا پینا موقوف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد نماز صبح ادا کی (۶) اور یوں ۱۱۔ مئی کی اس صبح کا آغاز ہوا جو اپنے دامن میں ایک عظیم طوفان لے کر طلوع ہوئی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کا شہر کمپنی کے سائے میں حسب معمول بیدار ہو کر نئے دن کی سرگرمیوں

Scanned by CamScanner

کا آغاز کر چکا تھا۔

علی الصبح دریائے جمنا دلی شہر کی نازنین عورتوں کے حسن و جمال سے تختۂ چمن بنا ہوا تھا۔ ہزاروں نازنینیں رنگین رنگین ریشمی ساڑھیاں اوڑھے ہوئے کمر کمر پانی میں غوطے لگا رہی تھیں۔ اکثر شوخ کم سن، الھڑ پنے کے دن آپس میں چھلم چھلا ہو رہی تھیں۔ ایک مصری مہاراج سونے تازے تنگ دھڑنگ ٹانگوں میں لنگوٹی، سر پر چوٹی جٹا لٹکائے ایک پتھر کے چھوٹے سے چکلے پر ایک ہاتھ سے صندل گھستے جاتے تھے۔ دریا سے نکلنے والی نازنینوں کو وہ پیشانی پر صندل کا ٹیکہ لگاتے تھے اور ایک پنکھڑی تلسی ہاتھ پر رکھتے جاتے تھے۔ (۷)

۱۱۔ مئی کا دن دلی کے عام دنوں کی طرح سے ایک تھا۔ سب کچھ قاعدے اور دستور کے مطابق شروع ہوا تھا۔ صبح کے وقت چرچ میں روزانہ عبادت روز مرہ کے مطابق ہوئی تھی اور آنے والوں کا مختصر سا اجتماع فراغت کے بعد گھروں یا دفتروں کو فرائض کی ادائیگی کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ خزانہ اور محل شاہی میں ہفتہ وار ڈیوٹی دینے والے محافظین آج فارغ ہوئے تھے۔ شہر کے سول سرجن ڈاکٹر بالفور (Dr. Balfour) جیل اور ڈسپنسری کا چکر لگانے چلے گئے تھے (۸)۔ ۱۱۔ مئی کو دلی کے صدر الصدور نے صبح کا آغاز کس طرح کیا تھا، اس کا ایک منظر دیکھیے:

> "صبح کا وقت تھا۔ عدالت اور کچہریاں اس ٹھنڈے زمانہ میں گرم ہوتی تھیں۔ نیا محل کی سڑک پر بڑی حویلی کے سربلند دروازے کے آگے مفتی صدر الدین صاحب صدر الصدور کی فٹن تیار کھڑی تھی۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل تھی کہ سوائے صدر الصدور کی دولت سرا کے شہر بھر میں فٹن گاڑی نہیں تھی۔ کیونکہ اس وقت فٹن عنقا سمجھی جاتی تھی۔ صدر الصدور صاحب چونکہ فرنگیوں کے نوکر تھے۔ اس لیے یہ انوکھی چیز آپ کے پاس تھی۔ اس گاڑی میں دو گھوڑیاں جتی ہوئی تھیں۔ یکا یک مفتی صاحب دیوان خانہ سے باہر تشریف لائے اور فٹن میں سوار ہو گئے۔ سامنے کی

Scanned by CamScanner

بیٹھک پر آپ کا پیشکار بیٹھ گیا اور اس نے کوچبان سے کہا کشمیری دروازہ میں ہو کر کچہری کو چلو۔ اتنا کہتے ہی فٹن چل دی۔ صبح کا سہانا وقت مردہ دلوں میں بھی امنگ پیدا کرتا تھا۔ گھوڑیاں فراٹے بھرتی انگھلیاں کرتی چلی جاتی تھیں جو سامنے کشمیری دروازہ آ گیا۔ کوچبان نے گھوڑیوں کی رفتار کو تھوڑا سا دھیما کیا، دروازہ کے برابر باہر کی طرف ایک سپاہی اوپچی بنا ہوا بندوق میں سنگین لگائے پہرہ پر کھڑا تھا۔ یہ قوم کا پوربیہ تھا اس لیے اس کا رنگ کالا اور قد بہت لمبا تھا۔ اس سنتری نے مفتی صاحب کو انگریزی قواعد کے موافق بندوق اور سنگین سے سلامی دی اور چند ہی منٹ میں مفتی صاحب اپنی کچہری میں پہنچ گئے۔ آپ کے کمرے میں دری چاندنی قالین کا فرش تھا۔ گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ گئے دو رویہ وکیل مختار مدعی مدعا علیہ چاندنی پر حاضر ہوئے اور عدالت گرم ہوئی۔ (۹)

اس سے لال قلعہ کا ثمن برج عکس شفق سے سنہری نظر آ رہا تھا۔ یہ بادشاہان تیموریہ کی خاص نشست گاہ تھی۔ یہ وہی برج تھا جہاں شاہ جہاں نماز فجر کے بعد جھروکوں میں بیٹھ کر درشن دیا کرتا تھا۔ اس دور سے یہ رسم بن گئی تھی کہ دلی کے بادشاہ ثمن برج کے جھروکوں میں بیٹھ کر درشنیوں کو درشن دیا کرتے تھے۔ اسی رسم کے مطابق ۱۱۔ مئی کو ظل سبحانی سراج الدین ابوظفر بہادر شاہ ظفر ثانی فریضہ صبح سے فارغ ہو کر جھروکوں میں بیٹھے ہوئے وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ سواری کی تیاری تھی۔ تخت رواں جس کا سنہری ہودا تھا اس پر زربفت کی مسندیں لگی ہوئی تھیں اور کاشانی مخمل کا غلاف تھا، تسبیح خانہ کے صحن میں پڑا تھا۔ جہاں پر خواجہ سرا، خواص اور چند معزز درباری حاضر تھے اور ظل سبحانی کے برآمد ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ تسبیح خانہ کے چبوترے کے نیچے پچاس ساٹھ کہار سرخ بانات کی وردیوں اور سرخ پگڑیوں میں کمربستہ کھڑے تھے۔ ظل سبحانی نے اچانک جمنا کے پل کے جانب دیکھا تو حیران ہوئے کہ دریا کا کنارہ گرد و غبار،

Scanned by CamScanner

دھوئیں اور آگ سے تیرہ و تار ہو رہا تھا۔ میر بحری کے بنگلے میں آگ لگ رہی تھی اور شعلے آسمان کی جانب بلند ہو رہے تھے۔ رسالدار کو حکم دیا گیا کہ سوار بھیج کر خبر دو کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ گھوڑ سوار ابھی رستے میں سلیم گڑھ کے پل پر ہی تھے کہ جمنا کی جانب سے بے تحاشا لوگ بھاگتے ہوئے ملے۔ ان سے یہ خبر ملی کہ دلی پر کوئی غنیم چڑھ آیا ہے۔ اس نے میر بحر کو مار ڈالا ہے۔ بنگلہ پھونک دیا ہے۔ مال کا صندوق اور گولک لوٹ لی گئی ہے۔ اسی وقت بادشاہ کی طرف سے حکم جاری کیا گیا کہ دریا کا پل توڑ کر کشتیاں کھینچ لی جائیں تاکہ غنیم اترنے نہ پائے۔ شہر پناہ کے تمام دروازے بند کر دیے جائیں۔ کوتوال شہر کو کہا گیا کہ وہ حفاظت کی غرض سے کلکتہ دروازے پر خود حاضر رہے۔ (۱۰)

۱۱ مئی کی خبریں دیتے ہوئے ''دلی اردو اخبار'' اطلاع دیتا ہے کہ حکام وقت کوداروغہ پل نے یہ خبر دی کہ آج صبح چند ترک سوار میرٹھ سے آئے، پل عبور کر کے انہوں نے ہم پر ظلم کیا۔ محصول گھر کو لوٹا اور اسے نذر آتش کر دیا۔ حکام نے اسی وقت جلدی جلدی مشورہ کر کے خزانے کے محافظین کو تیار رہنے کا حکم دیا اور کچہری کے تمام عملہ میں یک دم کھلبلی مچ گئی۔ (۱۱)

مفتی صدرالدین کے پیش کار نے دوڑ کر ان کے کمرہ عدالت میں یہ خبر سنائی۔

''جناب عالی! غدر پڑ گیا۔ سرکار کمپنی کی فوج اس سے بگڑ گئی ہے۔ شہر میں دندناتی پھرتی ہے اور قیامت برپا کر رہی ہے۔ شہر کے سب دروازے بند کر لیے ہیں۔ حضور فٹن میں سوار ہوں اور کسی طرح شہر میں پہنچ جائیں۔ مفتی صاحب نے اس بیان کو حیرت سے سنا اور کہا انا للہ و انا الیہ راجعون۔ غالیچہ پر سے اٹھے اور باہر تشریف لائے اور گاڑی میں سوار ہو گئے۔ جب کشمیری دروازہ کے پاس پہنچے تو دیکھا دروازہ بند ہے اور وہی پوربیہ سنتری بدستور پہرہ پر کھڑا ہے مگر تیور خراب ہیں اسے

Scanned by CamScanner

[illegible] دروازہ [illegible] کی بات کا جواب ہی نہیں دیتا [illegible] دیا بھی تو یہ جواب دیا ہے۔ [illegible] سے چابی نہیں اور [illegible] باہر سے کچھ کھولنا چاہئے الی الی۔'' حالانکہ مفتی صاحب کی گاڑی کشمیری دروازہ کے پاس سے جا چکی تھی اور سنتری مفتی صاحب کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ مگر سلام نہ سلامی گویا ان تلوں میں تیل ہی نہ تھا۔ مفتی صاحب کے آدمیوں نے انہیں منت تک دروازہ پیٹا اور چیخے کہ ''صدر الصدور کھڑے ہیں اور روزہ منہ میں ہے اور لو چلنے لگی ہے دروازہ کھولو۔'' مگر دربانوں کو سانپ سونگھ گیا تھا کوئی خبر نہ ہوئی جھک ہوکر صدر الصدور صاحب کے پیش کار نے اسی پوربیہ سے کہا۔ ''بزاری جی صدر الصدور صاحب بڑی تکلیف میں ہیں۔ آپ کہہ کر دروازہ کھلوا دیجئے۔'' بزاری کا لفظ سن کر پوربیہ سنتری پھولا نہ سمایا اور اس نے کہا۔ ''اچھا بجور۔'' اور اس نے باہر سے دستک دی اور اندر والوں نے فوراً اتنا دروازہ کھولا کہ مفتی صاحب کی فٹن داخل ہوگئی۔ شاید فٹن کے پیچھے لگے ہوئے دو چار آدمی اور کشمیری دروازہ میں گھس آئے اور دربانوں نے جھٹ پٹ دروازہ بند کر کے قفل ڈال دیا اگرچہ مفتی صاحب سے کسی نے کچھ روک ٹوک نہیں کی مگر مفتی صاحب نے شہر کو لٹتے گھسیٹتے بے گناہوں کو ظالموں کے پنجہ میں گرفتار ضرور دیکھا۔ مفتی صاحب اس جانگداز سیر کو دیکھتے آنسو بہاتے اپنے دولت خانہ میں داخل ہو گئے۔'' (۱۲)

جمنا کے پل کو روند کر دلی میں داخل ہونے والے وہ سپاہی تھے جو میرٹھ سے بغاوت کر کے دلی پہنچ رہے تھے۔ ہندوستان بھر میں انقلابی سرگرمیوں کے ذریعے کمپنی کو ہندوستان

سے نکال پھینکنے کے جذبے سے سرشار ہو رہے تھے۔ ان سپاہیوں کو روکنے کی بہت کوششیں کی گئیں مگر وہ روکے نہ جا سکے۔ سپاہیوں کے اولین گروہ ۹ بجے صبح دلی کے دروازوں تک آ پہنچے تھے اور جلد ہی انہوں نے لال قلعہ کے دیوان خاص اور تسبیح خانہ میں پہنچ کر بادشاہ بہادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کی درخواست پیش کی۔ انہوں نے بادشاہ کے سامنے بیرک پور، برہام پور اور میرٹھ کے تمام واقعات عرض کیے۔ انگریزوں کے مظالم، ناانصافی اور ملک دشمنی کا ذکر کیا اور یہ کہا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ آپ ہمارے سروں پر اپنا ہاتھ رکھیں۔ ہماری سرپرستی کریں۔

سپاہیوں کی اس استدعا کا واحد مقصد یہ تھا کہ بہادر شاہ مغلوں کی روایت کے مطابق ہندوستان کے شہنشاہ بن کر راج کریں اور ہندوستان میں دوبارہ ہندوستانیوں کی حکومت بحال ہو جائے۔ بہادر شاہ کے لیے صورت حال ابھی تک واضح نہ ہو سکی تھی۔ اسے سپاہیوں کی طاقت، وسائل اور صلاحیتوں کا کوئی اندازہ نہ تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی غیر یقینی صورت حال کے سپرد نہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے انگریزوں کی عسکری طاقت کا اچھی طرح سے اندازہ تھا اس لیے وہ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا تھا کہ جس کے سبب مستقبل میں اسے مصیبت کا سامنا کرنا پڑے اس کا حال مطمئن تھا اور زندگی شادمانی سے بسر ہو رہی تھی۔ سپاہیوں کا ساتھ دینے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ انقلاب کی ناکامی سے اسے ان تمام آسائشات سے محروم ہونا پڑے گا۔ لہٰذا بہادر شاہ نے اس موقع پر نہایت جچی تلی تقریر کی اور انقلابیوں کی حوصلہ افزائی کرنے سے گریز کیا اور اپنے آپ کو اس انقلاب سے الگ رکھنے کی کوشش کی

> "سنو بھائی! مجھے بادشاہ کون کہتا ہے میں تو فقیر ہوں ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کو لیے بیٹھا ہوں۔ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ میرے باپ دادا بادشاہ تھے جن کے قبضہ میں ہندوستان تھا۔ سلطنت تو سو برس پہلے میرے گھر سے جا چکی تھی۔ میرے جد و آبا کے نوکر چاکر اپنے خاندان نعمت کی اطاعت سے جداگانہ رئیس بن بیٹھے۔

میرے باپ دادا کے ہاتھ سے ملک نکل گیا۔ قوت لایموت کو محتاج ہو گئے۔ خصوصاً میرے جد بزرگوار حضرت شاہ عالم بادشاہ غازی کو جب غلام قادر نمک حرام نے قید کر کے نابینا کیا ہے تو پہلے مرہٹوں کو طلب کیا گیا تھا اور انہوں نے اس نمک حرام کو کیفر کردار کو پہنچایا۔ حضرت بادشاہ کو قید سے چھڑایا۔ چند سال مرہٹے بادشاہ کی جانب سے مختار رہے۔ مگر بادشاہ کے صرف مطبخ کا بندوبست بھی نہ کر سکے۔ لاچار ہو کر میرے دادا نے جناب سلطنت برطانیہ رجوع کیا اور انگریزوں کو بلوا کر اپنے گھر کا مختار فرمایا اور ملک ہندوستان ان کے تفویض کیا اور ان لوگوں نے حسب دل خواہ اخراجات شاہی کا بندوبست کر دیا اور ملک میں امن وامان کا ڈنکا بجا دیا۔ اس روز سے آج تک ہم لوگ بہ عیش و عشرت تمام بسر کرتے چلے آتے ہیں۔ ہمیں کسی طرح کا فکر و اندیشہ دامن گیر نہیں اور کمال خوش حالی و فارغ البالی و عیش و عشرت سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ لڑائی جھگڑے سے کچھ کام نہیں اس کا انسداد اور انتظام انگریز لوگ خود کر لیتے ہیں۔ میں تو اک گوشہ نشین آدمی ہوں مجھے ستانے کیوں آئے۔ میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دوں گا۔ میرے پاس فوج نہیں کہ میں تمہاری امداد کروں گا۔ میرے پاس ملک نہیں کہ تحصیل کر کے تمہیں نوکر رکھوں گا۔ میں کچھ نہیں کر سکتا ہوں۔ مجھ سے کسی طرح سے توقع استعانت کی نہ رکھو۔ تم جانو یہ لوگ جانیں۔ ہاں ایک امر میرے اختیار میں ہے البتہ وہ ممکن ہے کہ میں تمہارے درمیان میں ہو کر انگریزوں سے تمہاری صفائی کرا سکتا ہوں۔" (۱۴)

دلی میں میرٹھ کے انقلابیوں کی آمد کی خبر یورپین حلقوں میں تیزی سے پھیل گئی۔ یہ

Scanned by CamScanner

سب سے پہلے مجسٹریٹ ہچنس(Hutchison) کو موصول ہوئی جو اس وقت کچہری میں مصروف کار تھا۔ اس کے بعد جج لے باس(Le Bas) کمشنر سائمن فریزر اور سب سے آخر میں چیف پولیس آفیسر تک بھی پہنچ گئی۔(۱۵) ہچنس(Hutchison) اسی وقت گھوڑے پر سوار ہو کر چھاؤنی کی طرف گیا تا کہ شہر میں داخل ہونے والے سپاہیوں کی روک تھام کرنے کے لیے فوج کو تیار کروایا جائے۔ کمشنر سائمن فریزر(Simon Fraser) کا سرکاری دفتر اور رہائش کچہری دروازے کے شمال میں لڈلو کیسل (Ludlow Castle) میں تھی۔ جب یہ خبر لڈلو کیسل میں پہنچی تو فریزر اس وقت غسل خانہ میں تھا۔ خبر سن کر وہ اچانک چونک اٹھا یہ کہا جاتا ہے کہ میرٹھ کے واقعات کے بارے میں آگاہی کے لیے اسے ۱۰۔ مئی کی رات اطلاع موصول ہوئی تھی مگر اس وقت شہر کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ لہٰذا اس نے سوچا کہ کل صبح تک کچھ بھی نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے اس نے حفظ ماتقدم کے طور پر اقدامات نہ کیے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ رات گیارہ بجے میرٹھ سے آنے والے سوار نے اسے ایک چٹھی لا کر دی تھی۔ فریزر اس وقت نیند کے غلبے میں تھا۔ معمولی چٹھی سمجھ کر جیب میں رکھ لی اور سو گیا۔ فریزر دلی کا کمشنر اور گورنر جنرل کا ایجنٹ تھا۔ اس حیثیت سے وہ سب سے ذمہ دار افسر سمجھا جاتا تھا۔ وہ فوراً بگھی میں بیٹھ کر قلعہ کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں انقلابیوں نے اس پر حملے کیے مگر وہ قلعہ تک جا پہنچا۔ بہادر شاہ سے صلاح مشورے کے بعد اس نے انقلابی دستوں کو سمجھانے کی کوشش کی انہیں خدا اور انجیل کا واسطہ دے کر کہا کہ وہ بغاوت سے باز آ جائیں۔(۱۸) مگر سپاہی اس کی باتوں سے متاثر نہ ہو سکے۔ اسی دوران میں ایک سپاہی نے طیش میں آ کر کمشنر فریزر پر گولی چلا دی۔ نشانہ خطا گیا، گولی تسبیح خانہ کے ایک ستون سے جا ٹکرائی۔ قلعہ کے کمان دار کیپٹن ڈگلس (Captain Douglas) کی رہائش قلعہ کی بالائی منزل پر تھی۔ فریزر اوپر جانے والی سیڑھیوں پر تلوار تھامے کھڑا تھا۔ قلعہ کے محافظ دستے کا ایک اردلی مغل بیگ آگے بڑھا اور اس نے تلوار کے ایک ہی وار سے اسے گرا دیا۔ اس کے بعد سپاہیوں نے کام تمام کر دیا۔

Scanned by CamScanner

ڈگلس(Douglas) کی رہائش گاہ میں اس روز کچھ مہمان بھی قیام پذیر تھے۔ اس کے بعد جیننگز(Jennings) نے صبح کے وقت ٹیلی سکوپ کی مدد سے پل کے پار سے آنے والی سپاہ کی یلغار دیکھ لی اور خطرے کو بھانپ لیا تھا۔ فریزر کے قتل کے بعد انقلابی سپاہ نے ڈگلس کی رہائش کا رخ کیا اور وہاں کپتان ڈگلس کے علاوہ، مسٹر ہچنسن(Hutchinson) مسٹر جیننگ(Jenning)، خواتین کو ہلاک کر دیا۔

"دوپہر سے پہلے قلعہ کا صحن اور راہداریاں انقلابیوں سے پُر ہو چکی تھیں۔ وہ ننگی تلواریں لیے للکارتے تھے اور اپنے ساتھیوں کو بلا رہے تھے۔ یہ تھرڈ کیولری، ۳۸ ویں رجمنٹ اور میرٹھ انفنٹری (Merth Infantery) کے سپاہی تھے۔ دیوان عام میرٹھ سے آنے والے ہارے سپاہیوں کی بیرک(Barrack) بن گیا تھا جہاں وہ گند ڈال رہے تھے۔ پورے محل میں محافظ تعینات کر دیے گئے تھے۔ بے بس بادشاہ کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے محل پر فوج نے قبضہ کر لیا تھا۔" (۴۰)

انقلابی سپاہ کی کارروائیوں سے دلی شہر میں زبردست ہلچل مچ گئی تھی۔ سپاہی جگہ جگہ دوڑ دھوپ کر کے یورپین لوگوں کو تلاش کر کے قتل کرتے جا رہے تھے۔ پورے شہر میں جنگ جیسی حالت طاری تھی۔ "دلی اردو اخبار" کے رپورٹر نے ۱۱۔مئی کے ان چشم دید واقعات کو دیکھا تھا۔ ہم اس کی رپورٹ کے کچھ حصے یہاں درج کرتے ہیں جن سے ۱۱۔مئی کا زندہ منظر نامہ ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے:

"کشمیری دروازے سے لوگ بلاتحاشا بھاگے چلے آتے ہیں۔ مگر چونکہ حقیر کو تفریح طبع اور پاس خاطر اپنے ناظرین کا جان عزیز سے عزیز تھا۔ لہذا بے تکلف واسطے دریافت حال کے سیدھا اسی طرف روانہ ہوا کہ زیر کوٹھی سکندر صاحب(Skinner) پہنچ کر ایک آواز بندوقوں کی باڑ کی

Scanned by CamScanner

سامنے سے خالی دی اور آگے چلا تو دیکھا کہ صاحب بہادر پیدل شمشیر برہنہ در کف سراسیمہ و بدحواس بے تحاشا بھاگے چلے آتے ہیں اور پیچھے پیچھے ان کے چند تلنگے بندوقیں سر کرتے چلے آتے ہیں اور عوام شہر بھی کسی کے ہاتھ میں لکڑی اور کسی کے ہاتھ میں پلنگ کی پٹی، کسی کے ہاتھ میں بانس کا نوہ اس کے در پے چلے آتے ہیں۔ بلکہ بعضے بعضے آدمی شہر کے ہی چلا کر دور سے مار بھی بیٹھتے ہیں۔ وہ سب انگریز کو لیے ہوئے جانب زینت باڑے سے نہر کی طرف لے چلے اور حقیر بجانب میدان نصیر گنج چلا۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ فخر المساجد کے آگے بیس پچیس تلنگے مسجد میں گئے اور پیہم بندوقیں مار کر سب کو بندوقوں کی راہ سے سیدھا ملک عدم پہنچا دیا۔ آگے بڑھے تو پیش گرجا گھر اور زیر کوٹھی کانس صاحب دیکھا کہ دو سو تین سو ترک سوار اور تلنگے کھڑے ہوئے ہیں اور ان میں متفرق ہو کر ادھر ادھر پھیلتے جاتے ہیں اور ایک ایک سے سوال ہے کہ بتلاؤ انگریز کہاں ہیں اور جو کوئی پتا نشان بتلاتا تھا ان ہی میں سے دو چار سپاہی فوراً اس کے ساتھ ہو لیتے تھے اور ایک آنا فانا میں دیکھا گیا کہ جس کوچہ میں دیکھو دو تین انگریز مرے ہوئے پڑے ہیں ایک ایک کوٹھی میں گھس گھس کر انگریزوں کو معہ زن و فرزند تہ تیغ کیا اور جو بچ کر کسی کے گھر کوچہ و بازار کی موریوں میں جا چھپا وہ اس وقت بچ رہا۔ کوٹھیوں کا مال اسباب لٹ گیا۔ گرجا گھر اور کچہری کی تمام کرسیاں اور میزیں اور بلکہ فرش زمین وغیرہ سنگ مرمر تک بھی لوگ اٹھا لائے۔ بعد تھوڑی دیر کے حقیر بطرف میگزین گیا تو مسجد نواب حامد علی خاں سے آگے بڑھ کر دیکھا کہ نکسن صاحب سر دفتر کمشنری کا لاشہ پڑا ہے اور کسی

Scanned by CamScanner

قریب ... [illegible]

... [illegible] دلی ... [illegible]

تقریباً دوپہر کے ... نے بھاگ کر ایک عمارت کی چھت ...

... کے بچے، بیوی اور ... ہلاک ہو گئے۔ (۲۳)

... بغاوت کا اعلان ... انقلابیوں کا بھی یہی حال ہوا۔ اس صبح مطبع کے عیسائی کارکن کام ...

دلی پریس کی ... تھے۔ جو بڑی تیزی صبح سویرے کی یہ خبر میں آیا تھا کہ ...

تھے مگر انجانی دل برداشت اور خوف زدہ تھے اور جلد ہی شہر کے دروازوں پر ہوں گے۔ دلی

کے باغی دلی کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ... یہ خبر شائع کر کے خود اپنی موت کے وارنٹ کا اعلان کر چکا

گزٹ کا عملہ ہنگامی اشاعت میں ... انقلابی سپاہ نے حملہ کیا، عملے کو ہلاک کر کے دفتر تباہ

تھا۔ دوپہر کے بعد دلی گزٹ پر بھی

کر دیا۔ (۲۴)

دلی کالج، دلی شہر کی سب سے ممتاز جدید علوم کی درس گاہ تھی۔ ۱۱۔ مئی کی دوپہر کو یہ درس گاہ دلی کے شہریوں اور سپاہیوں نے لوٹ لی۔ اس درس گاہ کی میز کرسیاں، نہایت قیمتی سائنسی آلات، کتب خانہ، نقشہ جات وغیرہ لوگ لوٹ کر لے گئے۔ کمروں کی چوکھٹ اور دروازے تک نکال لے گئے۔ مولوی ذکاء اللہ دلی کالج کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کالج کا کتب خانہ بری طرح لوٹا گیا۔ لٹیرے عربی، فارسی، اردو، وغیرہ کی کتابیں گٹھریاں باندھ باندھ کر کتب فروشوں، مولویوں اور طلبہ کے پاس فروخت کرنے کے لیے لے گئے۔ ان لوگوں نے انگریزی کتب کے شیرازے توڑ کر ان کے پٹھے اتار لیے تاکہ جلد سازوں کے پاس پہنچ سکیں اور اوراق کو پھاڑ کر کالج کے باغ میں ڈھیر لگا دیے۔ آلات طبیعہ کو توڑ کر ان کا لوہا اور پیتل نکال کر لے گئے۔ عمارت کو آگ نہیں لگائی مگر کواڑ وغیرہ اتار کر لے گئے۔ سارا اسباب الماریاں، بنچ، کرسیاں، پرنسپل اور ہیڈ ماسٹر کا گھر لوٹ لیا گیا۔ (۲۵) دلی کالج کا پرنسپل ٹیلر بھی اسی ہنگامی حالت میں مارا گیا۔ دلی کے اعلیٰ انتظامی افسروں میں سے شاہد تھیو فلیس

(Theophilus Metcalfe) کی زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ وہ دلی کے مشہور ریذیڈنٹ ٹامس مٹکاف Thomas Metcalfe کا بھتیجا تھا اور اس وقت شہر کا جوائنٹ مجسٹریٹ تھا۔ شہر کے اندر اس پر متعدد حملے ہوئے مگر وہ بچ گیا۔ شہر پناہ کے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ شہر کے باہر ایک عام آدمی نے اسے ایک پرانے غار میں پناہ دلوائی۔ انقلابی سپاہ نے غار کے اندر بھی اس کا پیچھا کیا۔ مٹکاف نے غار میں آنے والے ایک سپاہی کا سر قلم کر دیا جس پر سپاہیوں نے یہ سمجھ لیا کہ غار میں کوئی خبیث روح موجود ہے۔ سپاہی دہشت زدہ ہو کر واپس چلے گئے اور مٹکاف وہاں سے بچ کر آگے روانہ ہو گیا۔ (۲۶) دلی کے کشمیری دروازے کے اندر کرنل جیمس سکنر (James Skinner) اپنے دور کی ایک داستانی شخصیت تھا۔ اس کی کوٹھی اپنی شان و شوکت کے سبب بہت مشہور تھی۔ ۱۸۰۳ء میں دلی پر لارڈ لیک (Lord Lake) کے قبضے کے بعد سکنر (Skinner) کے اررِیگولر کیوالری یونٹس (Irregular Cavalry Units) سکنر ہاؤس (skinner House) کے نام سے بہت مشہور تھے۔ اس نے نہ صرف فوج میں بڑا نام کمایا تھا۔ بلکہ تجارت میں بھی بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ (۲۷) دلی اردو اخبار کے رپورٹر کے مطابق سکنر کی کوٹھی اس قدر لوٹی گئی کہ بیان سے باہر ہے۔ (۲۸)

۱۱۔ مئی کے واقعات میں بہت اہم واقعہ دلی کے بارود خانہ کا دھماکہ تھا۔ دلی کا معروف بارود خانہ کشمیری دروازے کے جنوب مشرق میں فصیل شہر کے ساتھ تھا۔ قلعہ سے دور نہ تھا۔ بارود خانہ کی نگرانی یورپین افسروں کے سپرد تھی۔ شہر پر قبضہ کر لینے کے بعد سپاہیوں نے بادشاہ کی طرف سے یورپین عملہ کو بار بار یہ پیغام دیے کہ وہ عمارت کے دروازے کھول دے اور بارود خانہ انقلابی فوج کے سپرد کر دیا جائے۔ مگر ان پیغامات کا جواب نہیں دیا گیا۔ عملہ نے ہر ممکن حد تک فوج کا مقابلہ کیا اور آخری حربے کے طور پر بارود خانہ کو نذرِ آتش کر دیا۔ یہ شام چار بجے کا وقت تھا جب قیامت خیز دھماکے کی آواز سنائی دی تھی۔ (۲۹) ''دلی اردو اخبار'' کے مطابق بس ایک زلزلہ بآوازِ مہیب معلوم ہوا تھا۔ یوں لگا کہ اسرافیل نے صورِ قیامت پھونک دیا ہو۔

Scanned by CamScanner

... اس میں ہی رنگ ... کے ... قول ...

... دلی کی بیچ ... چھپ گیا ... (۳۰) انہیں اندازہ ... شہری لوگ زیادہ

... آدمی میں ... معلوم ہوتے تھے۔ (۳۱) دہلی کے سب انقلابی کم مگر ... بھوڑی گئی ہوں۔ (۳۲)

فرار ہو کر ... ایک ساتھ ... ہوئے تھے۔ کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور مارے لگے تھے۔ ... دلی کے اندر ... اور لوٹ مار کے واقعات ۱۱۔ مئی کے انقلاب کے نتیجہ میں دلی کے ... اور لٹے پٹے شہر کا منظر پیش کر رہی بہادر شاہ بادشاہ بن چکا تھا۔ مگر سپاہیوں کی وحشی ... کی بجائے ایک ویران اور ... شام کا ایک کے باعث ۱۱۔ مئی کی شام آزادی کے جشن ... کے بعد جو منظر دیکھا وہ اس تھی۔ ظہیر دہلوی نے شام کے وقت قلعہ سے باہر نکلنے

منظر پیش کرتا ہے:

"دیوان عام کے چوک میں ہوتا ہوا نقار خانہ کے دروازے سے نکل کر قلعہ کے لاہوری دروازہ سے باہر آیا۔ شام کی تاریکی پھیل گئی۔ جب میں اردو بازار کی سڑک پر آیا ہوں تو شہر میں سناٹا تھا۔ سڑک پر ایک چڑیا نہ تھی۔ ایک عجیب بے رونقی تھی۔ شہر کا شہر کھانے کو دوڑتا تھا۔ جا بجا دوکانیں لوٹی پڑی تھیں۔ مکانوں کے دروازے بند تھے۔ روشنی کا نام نہ تھا۔ لالٹینوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے میں خونی دروازہ کے آگے ہوتا ہوا کوتوالی کے سامنے سے گزر کر چھوٹے دریبہ کے پھاٹک پر پہنچا اور چھوٹے دریبے میں چمڑے والوں، مٹھائی والوں اور بزازی کی دکانیں سب لٹی ہوئی پائیں اور صراف کی دکان پر ایک اجودھیائی فقیر برہمن زخمی پڑا ہوا تھا۔ وہ ہائے ہائے کر رہا تھا۔ اس کی پشت کے اوپر تین زخم ہلکے ہلکے تلوار کے تھے۔" (۳۳)

۱۲۔ مئی کو بھی شہر ہنگامی صورت حال میں گرفتار تھا۔ "دلی اردو اخبار" جو انقلاب کا بڑا

Scanned by CamScanner

مداح تھا۔ کہتا ہے کہ شہر بہت لوٹا جا رہا ہے۔ بہت سے لوگوں نے یہ طریق اختیار کیے ہیں کہ تلنگوں کی صورت بنا کر شہر میں لوٹ مار کر رہے ہیں۔ انہوں نے میگزین اور انگریزوں کی کوٹھیوں سے بندوقیں، اسباب و آلات وغیرہ کی لوٹ مار کی ہے۔ (۳۴) "دلی اردو اخبار" اس بات کی مسلسل شکایت کرتا ہے کہ رعایا لوٹ مار کے سبب بہت تنگ، حیران اور سرگرداں ہے۔ کیا شہری اور کیا باہر والے بیشتر لوٹ مار کر رہے تھے۔ تھانہ جات کی عمل داری اور طاقت پہلے کی نسبت عشیر عشیر بھی نہیں رہی تھی۔ (۳۵) شہر کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ لوٹ مار کرنے والے پوربی سپاہیوں کو ساتھ لیے پھرتے تھے۔ جہاں کوئی مال دار گھرانہ دیکھتے تو سپاہیوں کو کھڑا کر کے اہل خانہ پر الزام لگاتے کہ یہاں میم چھپی ہوئی ہے یا انگریز موجود ہیں۔ اس بہانے سے وہ گھر کے اندر گھس کر تلاشی لیتے اور مال و دولت لوٹ لیتے تھے۔ یہ تو شہر کا حال تھا۔ ۱۲۔ مئی کی صبح کو چھاؤنی میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ جلے ہوئے بنگلوں کے آثار موجود تھے۔ مال و اسباب بکھرا پڑا تھا۔ یہاں تین دیسی پلٹنیں مقیم تھیں وہ توپ خانہ لے کر شہر میں آ گئی تھیں اور اپنے یورپین افسروں کو جہاں تک ممکن ہوا تہ تیغ کر چکی تھیں۔ دلی شہر اور نواحی علاقوں کے تمام یورپین پہاڑی (Ridge) کے فلیگ سٹاف ٹاور میں حفاظت کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ دیسی سپاہیوں کو مکمل طور پر انقلابی روپ میں دیکھ کر اب ان کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ مقام محفوظ نہیں ہے۔ چنانچہ یہاں سے یورپین افسر مع ان کے خاندان چھپ چھپا کر انبالہ، میرٹھ اور کرنال جیسے مقامات کی طرف جاتے رہے۔

یورپین خاندانوں کے بہت سے بچوں اور عورتوں کو محل میں پناہ دی گئی تھی۔ بہادر شاہ کا حکم تھا کہ ان کی حفاظت کی جائے مگر ۱۶۔ مئی کو انقلابی سپاہ نے جوش انتقام سے ان سب کو ہلاک کر دیا۔ ان کی تعداد پچاس تھی۔ اس حادثے سے خوف زدہ ہو کر سب یورپین فلیگ سٹاف ٹاور سے نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ ۱۶۔ مئی کے بعد دلی شہر اور چھاؤنی میں ایک بھی یورپین موجود نہ تھا۔ (۳۶) دلی سے کمپنی کی حکومت کا مکمل طور پر خاتمہ ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی شہر کا نظم و

Scanned by CamScanner

قلق اور انگریزی اقتدار عملی طور پر قائم ہو گیا تھا۔

ستمبر ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک (Lord Lake) کے دلی پر قبضے کے بعد سے ۱۸۵۷ء تک دلی شہر کمپنی کی انتظامیہ کے اہتمام سے چل رہا تھا۔ شہر کا کمشنر، مجسٹریٹ اور دیگر افسران شہر کے انتظام، عدالتی نظام، امن و امان اور دیگر ضروری امور پر کڑی نظر رکھتے تھے جن میں قلعہ سے متعلق معاملات بھی تھے۔ (جو بہت حساس نوعیت کے حامل سمجھے جاتے تھے) قلعہ کا ریذیڈنٹ جو عموماً بہت سمجھا ہوا افسر ہوتا تھا۔ یہ خدمات انجام دیتا تھا۔ بادشاہ، محل اور اہالیان قلعہ کی نقل و حرکت، دربار کے کوائف، شاہی خاندان کے عزائم حتیٰ کہ ان کے نجی معاملات کی بھی برابر خبر رکھی جاتی تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ شاہی خاندان کسی بھی قسم کی منصوبہ بندی کا عزم کرے اور اس کی خبر ریذیڈنٹ تک نہ پہنچ سکے۔ قلعہ کے اندر باہر اوپر سے نیچے تک ہر سطح پر کمپنی کے جاسوس اور گماشتے موجود رہتے تھے جو اپنے آقاؤں کو قلعہ سے متعلق دن بھر کی روداد پیش کرتے تھے جس کی ایک مثال جیون لال ہے جو ہر شام قلعہ کی رپورٹ شہر کے حکام کو پیش کیا کرتا تھا۔

۱۱۔ مئی ۱۸۵۷ء کو شہر کا مجسٹریٹ تھیوفلیس مٹکاف (Theophilus Metcalfe) تھا۔ وہ ایک سخت گیر افسر تھا اور شہر کے امن و امان اور جان و مال کی حفاظت کا ذمہ دار تھا۔ دلی کا کمشنر شہر کے مجموعی انتظامات کی نگرانی کرتا تھا۔ وہ شہر کے تمام شعبوں کا جائزہ لیتا رہتا تھا۔ شہر میں عدل و انصاف کے لیے عدالتیں قائم تھیں جن میں یورپین جج مقرر تھے اور دلی شہر کے مفتی صدر الدین یہاں کے صدر الصدور بھی تھے۔ شہر میں لین دین اور روپے پیسے کی بچت اور حفاظت کے لیے دلی بنک موجود تھا جو شہر کے اقتصادی معاملات کے لیے یورپین طرز کی سہولتیں فراہم کرتا تھا۔ شہر اور سرکاری خبروں کی اشاعت کے لیے ''دلی گزٹ'' (Delhi Gazette) تھا [جـ]ـس سے شہر کی ایک عمومی تصویر سامنے آجاتی تھی۔ اسی طرح سے کچہری اور خزانہ تھا جو شہر کی [انتظا]می اور مالی ضروریات کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتا تھا۔ شہر کے شمال حصے میں دور تک [...]ن پھیلی ہوئی تھی۔ یہیں دھیرج پہاڑی (Ridge) پر فلیگ سٹاف ٹاور (Flag staff

موجود تھا۔ چھاؤنی میں دیسی فوج کی پلٹنیں اور یورپین موجود تھے جو شہر کی حفاظت و ضبط اور کمپنی کے انتظام اور تحکم کی علامت کا وجود رکھتے تھے۔ چھاؤنی کی عسکری طاقت اور رعب و دبدبہ سے ہی دلی شہر کا عوامی ڈھانچہ خوش اسلوبی سے رواں دواں۔ چنانچہ اور شہر روزمرہ معمولات کے مطابق سوتا اور جاگتا تھا۔ کمپنی کے بنائے ہوئے اس ڈھانچے سے دلی شہر نصف صدی سے جاگیرداری تہذیب و ثقافت کو پیچھے سے لگائے ہوئے اپنے دن پورے کر رہا تھا۔

۱۱۔ مئی ۱۸۵۷ء کو جب میرٹھ کے سپاہی دلی میں داخل ہوئے تو یہاں کی صورت حال یک سر تبدیل ہوتی گئی۔ ان سپاہیوں نے پچھلی ایک صدی کا جوا پھینکنے کے لیے غیر ملکی آقاؤں کو قتل کرنا شروع کیا یا ان کو شہر سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ ان غیر ملکی آقاؤں کے رخصت ہونے کے ساتھ ہی ان کا بنایا ہوا انتظامی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ گیا۔ شہر کا مرکزی انتظام، امن و امان، جان و مال کی حفاظت، انصاف، عدالتی نظام اور نو آبادیاتی چھاؤنی کی عسکری طاقت بھی بکھر کر رہ گئی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ کسی کو کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

۱۰۔ مئی کی رات کو بہادر شاہ دلی کے علاقتی بادشاہ کی حیثیت سے سویا تھا۔ مگر دوسری صبح باغی سپاہ نے اسے ہندوستان کا شہنشاہ بنا دیا تھا۔ اس بات کا گمان اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ کمپنی کا انتظام و اہتمام ختم ہو جانے کے باعث جو بہت نازک صورت حال پیدا ہو گئی تھی بہادر شاہ اس میں کوئی بھی کردار ادا کرنے سے گریزاں تھا۔ اس سیال سیاسی حالت میں وہ اندر سے خائف بھی معلوم ہوتا تھا کہ اگر انگریز آ گئے تو کیا ہو گا۔ اس لیے انقلابی سپاہ کے سامنے اس کا انداز تخاطب معذرت ہی کا تھا۔ وہ اس مشکل سے نکلنا چاہتا تھا مگر باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔ مجبوراً اسے شہنشاہ بننا پڑا۔

۱۱۔ مئی ۱۸۵۷ء کے روز جب دلی کے لال قلعہ میں بہادر شاہ کی شہنشاہی کا اعلان

Scanned by CamScanner

ہوا تو اس وقت شہر عملی طور پر بغاوت کا گڑھ بن چکا تھا۔ میرٹھ کے سپاہی، دلی چھاؤنی کی سپاہ اور شہر کے برے لوگ لوٹ مار میں لگ گئے تھے یا قتل و غارت کر رہے تھے۔ کسی کا انتظامی کنٹرول نہ رہا تھا۔ یہ لوگ خود کو ہر قسم کی پابندی، قاعدے اور قانون سے آزاد سمجھنے لگے تھے۔ اس عالم میں شہر کا انتظام دلی کے بوڑھے شہنشاہ کی ذمہ داری بن گیا۔ کہولت کے باعث اس کے لیے یہ بار گراں تھا۔ اس کے ساتھ ہی انقلابی سپاہیوں کی عسکری تنظیم کا کام بھی اسے سنبھالنا پڑا۔ اس کے بعد آنے والے ایام میں فوجی اخراجات کی ذمہ داری بھی اس کے سر آن پڑی۔ ایک بوڑھے بے اختیار شہنشاہ کے لیے واقعتاً ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا بہت ہی مشکل تھا اور وہ بھی اس صورت میں کہ اسے ان معاملات کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ وہ تو ایک پنشن یافتہ شخص کی طرح گوشہ عافیت میں زندگی بسر کرنے کا عادی تھا۔ مگر ۱۱ مئی کی سیاسی صورت حال نے اسے شہر، فوج اور مالیات سے متعلقہ تمام امور کو چلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے پاس انتظام عامہ کو سنبھالنے کے لیے ذمہ دار افسر بھی نہ تھے۔ مرزا الٰہی بخش اور حکیم احسن اللہ خاں اس کے نامور معتمد تھے مگر دونوں انگریزوں سے وفاداری رکھتے تھے۔ انہیں نئے انقلاب سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ بہادر شاہ کے شہزادے معاملات سلطنت کا کوئی تجربہ نہ رکھتے تھے۔ انتظامی اور عسکری معاملات کی رہنمائی کے لیے ان میں صلاحیت نہ تھی۔ ان کی عسکری تربیت ہی نہ ہو سکی تھی۔ اس لیے یہ لوگ کوئی قابل قدر خدمت انجام نہ دے سکے۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے دلی پر انگریزوں کے مکمل قبضے ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء تک دلی شہر، عوام اور بہادر شاہ پے در پے مسائل اور مصائب کا شکار رہے۔ یہ سارے ایام انہوں نے شدید کش مکش میں گزارے۔

سپاہیوں کی انقلابی سرگرمیوں کے بعد دلی میں امن و امان، جان و مال اور نظم و نسق کو بحال کرنے کے لیے ایک دستور العمل کی ضرورت تھی۔ دلی کے نیشنل آرکائیوز میں ایک ایسا ہی دستور العمل موجود ہے۔ یہ جمہوری انداز کا دستور ہے۔ اس کے مطالعہ سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دستور کے مرتب کرنے والوں کے ذہن برطانیہ کے دستوری تصورات سے اچھی

Scanned by CamScanner

طرح واقف تھے۔ یہ لوگ ہندوستان کے گورنر جنرل کی کونسل کے اجلاس سے بھی بخوبی آشنا تھے۔ ان مرتبین نے جس طرح انگریزی زبان کے الفاظ استعمال کیے ہیں ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ انگریزی بھی ضرور جانتے ہوں گے۔ دلی کا انتظام چلانے کے لیے ایک تنظیم بنائی گئی تھی جسے ''کورٹ آف ایڈمنسٹریشن یعنی جلسہ انتظام فوجی و ملکی'' کا نام دیا گیا تھا جو دس ارکان پر مشتمل تھا اور اس کا ایک صدر مقرر کیا جاتا تھا۔

دلی حکومت کا مرتب کردہ دستور کتنا موثر ثابت ہوا، اس بارے میں کہنا کچھ مشکل ہے۔ البتہ ہمیں دو ایسے موقعوں کے متعلق خبر ملتی ہے کہ جب کورٹ نے احکام جاری کیے اور سوچ بچار کی۔ ۸ جولائی ۱۸۵۷ء کو کورٹ نے شہر کی لوٹ مار روکنے کے لیے احکام جاری کیے (۳۸) اسی طرح سے حکیم احسن اللہ خان کے مکان کی حفاظت کے لیے کورٹ کی طرف سے متفقہ طور پر جاری کیے جانے والے حکم نامہ کا حوالہ ملتا ہے۔ (۳۹)

شہر کی لوٹ مار دردِ سر بن گئی تھی۔ بہادر شاہ نے انقلاب کے دوسرے ہی دن شہر کے کوتوال کے نام حکم جاری کیا کہ لوٹ مار کرنے والوں کو گرفتار کیا جائے۔ (۴۰) تھانے داروں کو تاکید کی گئی کہ حاضر باش رہیں۔ (۴۱) یکم جون کو شہزادوں کے نام جاری ہوا کہ شہر کے انتظام کو دیکھیں۔ (۴۲) چوں کہ بہادر شاہ کی حکومت شدید بحران سے گزر رہی تھی اس لیے بہادر شاہ حالات کے مطابق احکامات جاری کرتا رہتا تھا۔ کسی تجربہ کار اور مضبوط انتظامیہ کی عدم موجودگی ں سارا بوجھ ضعیف بادشاہ پر آ پڑا تھا مگر وہ اس بڑھاپے میں بھی جو کچھ ممکن ہو سکتا تھا کرتا رہتا ۔ دراصل حکومت کا سارا انتظام Adhoc بنیادوں پر چل رہا تھا۔ فوج، انتظامیہ، عدلیہ اور ت کے سارے امور ہر آنے والے نئے دن کی ضرورت کے مطابق طے کیے جا رہے تھے۔ شاہ کو جہاں بھی کچھ امید نظر آتی وہ حکم جاری کر دیتا۔ ۲۔ جولائی کو جب بخت خان دربار ضر ہوا تو اسے فوج کا سپہ سالار بنا دیا گیا اور اسے کچھ خصوصی احکام بھی دیے گئے۔ ان م بھی تھا کہ سپاہ کو قلعہ اور شہر سے نکال کر باہر رکھا جائے جہاں قیام کا بندوبست ہو۔

Scanned by CamScanner

چودھریوں کو سرزنش کی جائے۔ کوئی شخص رعایا کو تکلیف نہ دے۔ تھانوں کا انتظام ...
انتظام تحصیلات اور تھانہ جات پر نظر رکھی جائے۔ (۴۳)

بخت خان کے آنے سے حالات کچھ بہتر ہوئے بہادر شاہ کی طرف سے ...
کا خطاب عطا کیا گیا۔ ایک ڈھال اور تلوار بھی ملی اور اسے کل افواج کا کمانڈر انچیف ...
اس موقع پر حالات بہتر بنانے کے لیے بخت خان نے جو کارروائیاں کیں ان کے بارے ...
چونی لال اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے:

''منادی کرادی گئی کہ پلٹنوں کے تمام افسروں کو ہدایت لینے کی غرض سے محمد بخت خاں کے پاس جانا چاہیے۔ مرزا مغل ایڈ جوٹنٹ جنرل مقرر ہوئے۔ محمد بخت نے بادشاہ سے کہہ دیا کہ اگر کسی شہزادہ نے شہر کو لوٹنے کی کوشش کی تو میں اس کی ناک اور کان کٹوا دوں گا۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ ''تمہیں پورے اختیارات حاصل ہیں جو بہتر سمجھو کرو۔'' اس حکم کی مطابقت میں شہر کے کوتوال کو اطلاع دے دی گئی کہ اگر شہر میں مزید لوٹ مار ہوئی تو تمہیں پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا اور جو سپاہی لوٹتے ہوئے پکڑے جائیں ان کو گرفتار کر لیا جائے۔ بخت خان نے اطلاع دی کہ شہر کے باہر میں حسب ذیل فوج کے ساتھ لڑنے کے لیے تیار ہوں۔

چار پیدل فوجیں۔

سات سو سوار۔

چھ بھاری توپیں جنہیں کھینچنے کے لیے گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں۔

تین میدانی توپیں۔

چودہ ہاتھی۔

Scanned by CamScanner

تین سو دس گھوڑے انگریزی رجمنٹ کے سرکاری اصطبل سے حاصل کیا گیا ہے۔

ایک سو چھ ہیں۔

فوج کو چھ مہینے کی پیشگی تنخواہ دے دی گئی۔ محمد بخت خاں نے کہا کہ میرے پاس چار لاکھ روپے موجود ہیں اور کہا کہ میں اب بادشاہ کو مزید زر حاصل کرنے کی غرض سے تکلیف نہ دوں گا اور اگر میری فوجیں کامیاب ہوئیں تو میں زائد روپیہ خزانہ میں داخل کر دوں گا۔ بادشاہ نے بریلی کی فوج کی ضیافت کے لیے چار ہزار روپے دیے۔ فوجی دستوں کے تمام کمانڈروں کو حکم دے دیا گیا کہ جنرل بخت خاں سے احکام حاصل کریں۔ آگرہ کی فوج کے نام بھی اسی قسم کے احکام نافذ کیے گئے۔ جنرل نے منادی کرا دی کہ تمام دکان داروں کو اپنے ہتھیار اپنے پاس رکھنے چاہئیں۔ جن اشخاص کے پاس ہتھیار نہ ہوں وہ ہیڈ کوارٹر سے طلب کر سکتے ہیں اور کسی حالت میں مکانوں کو غیر مسلح حالت میں نہ چھوڑا جائے۔ جو سپاہی لوٹ مار کرتا ہوا پکڑا جائے اس کے ہتھیار اس سے چھین لیے جائیں گے۔ جن اشخاص کے پاس گولہ بارود کا سامان ہو، انہیں چاہیے کہ وہ میگزین کے حوالہ کر دیں ورنہ سخت سزا دی جائے گی۔ پولیس کو حکم دیا گیا کہ جنرل کے دربار میں شہر دہلی کے تمام عمائدین کو شریک ہونے کے لیے کہا جائے۔ جنرل نے میگزین کا معائنہ کیا اور حکم دیا کہ گولہ بارود، ذخائر اور سامان اسلحہ کو باقاعدگی سے ترتیب دیا جائے۔"(۴۴)

۳۔ جولائی کو بادشاہ کی طرف سے جنرل بخت خان کے اختیارات میں مزید [illegible] کی منظوری دی گئی۔ اسے اختیار دیا گیا کہ لوٹنے والے اشخاص پر جرمانہ کر دو اور مظلوم

Scanned by CamScanner

انتظامی کاروبار [illegible] شہری انتظام، پولیس اور مال گزاری کے انتظامات اس کے [illegible] گئے۔ (۴۵) اسی روز ایک حکم کے ذریعے شہزادگان کو تمام فوجی امور اور [illegible] دیا گیا۔ (۴۶) ۲۸۔ جولائی کو بہادر شاہ کو خبر ملی کہ شہزادے شہر کی آبادی کو [illegible] رہے ہیں۔ اگلے روز بادشاہ نے یہ حکم دیا کہ کوئی شہزادہ دربار میں شریک نہ ہو [illegible] سرداروں کے نام احکام بھیجے گئے کہ تمام شہزادگان عتاب میں ہیں اگر وہ لوٹ مار کرتے [illegible] جائیں تو ان سے معمولی آدمیوں کا سا سلوک کیا جائے۔ ۷۔ جولائی کو تمام پولیس افسروں کے نام احکام نافذ ہوئے کہ محمد قلی خاں کو پورے اختیارات دے کر شہر کا مجسٹریٹ مقرر کر دیا گیا ہے۔ (۴۸)

بہادر شاہ کی انقلابی فوج کئی ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ دلی شہر کے اندر اتنی بڑی فوج کا قیام ممکن نہ تھا۔ شہریوں کے لیے زندگی کا یہ نیا تجربہ تھا۔ سپاہی لوٹ مار سے گریز نہ کرتے تھے۔ اس لیے بالآخر تنگ آ کر بہادر شاہ نے جنرل بخت خان کی آمد سے بہت پہلے ۲۴۔ مئی کو یہ حکم صادر کیا تھا کہ تمام فوجی پلٹنیں شہر کے باہر قیام کریں کیوں کہ شہر برباد ہو رہا ہے۔ شہزادگان کے لیے بھی یہ حکم تھا کہ وہ اپنی اپنی پلٹنوں کے ساتھ اپنے خیمے باہر لگائیں۔ (۴۹) مگر اس حکم پر مناسب عمل نہ ہو سکا۔ جیون لال ۴۔ جون کے روزنامچے میں لکھتا ہے کہ سپاہیوں نے دلی دروازے کی دکانوں کو خالی کرا کے ان کو بیرکوں میں بدل دیا ہے۔ (۵۰) دلی میں جون سے اگست تک انقلابی سپاہی دوسرے شہروں سے اسلحہ، توپ خانے اور خزانہ کے ساتھ مسلسل آتے رہے۔ ان ایام میں جب بھی کسی نئے لشکر کی آمد کی خبر ملتی۔ بہادر شاہ شہر کے کسی دروازے کے باہر اس کے قیام کا حکم دیتا تھا۔

بہادر شاہ کی نئی حکومت کے لیے انتظامی اور فوجی مسائل کے علاوہ کچھ اور سنگین مسائل بھی تھے۔ ان میں اہم تر مسئلہ تنخواہ کا تھا۔ سپاہی تنخواہ مانگتے تھے اور بہادر شاہ کے پاس مقصد کے لیے پیسہ موجود نہ تھا۔ تنخواہ نہ ملنے کے باعث سپاہی اور افسر بدتمیزی سے بھی گریز

Scanned by CamScanner

یہ کرتے تھے۔ بہادر شاہ اکثر حالات میں شدید ردعمل کا اظہار کرتا تھا۔ بارود کی بھی کمی تھی۔ سپاہی پیٹ کے لیے روٹی اور توپ کے لیے گولہ بارود چاہتے تھے۔ ان دونوں کا حصول بار بار آشوب کا باعث بنتا رہتا تھا۔

دلی کی نئی حکومت پیچیدہ مسائل کا شکار تھی اور دوسری طرف انگریز آہستہ آہستہ کرنال اور دوسرے مقامات پر جمع ہو رہے تھے۔ ادھر ادھر سے وہ دیسی سپاہ بھی حاصل کر رہے تھے۔ ان کا ایک ہی مطمع نظر تھا اور وہ تھا دلی کا دوبارہ حصول! ان کو پورا یقین تھا کہ وہ دلی پر دوبارہ قبضہ کر لیں گے۔ کرنل کیتھ (Colonel Keith) نے ۱۲ اور ۱۳۔ جون کو اپنی بیوی کے نام خطوط میں بڑے یقین کے ساتھ لکھا تھا کہ ہمارا مقصد دلی کا حصول ہے اور اس کے لیے ہر شے کو قربان کر دینا چاہیے۔ فتح دلی کے بارے میں کیمپ کے اندر کسی کو ذرا سا بھی شک نہیں ہے۔ مگر یہ فتح کب ہوگی اس کا فیصلہ ابھی ہونا ہے۔ (۵۱)

دلی سے نکالے جانے کے بعد انگریزوں نے اپنی بکھری ہوئی فوجی طاقت کو بہت جلد منظم کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہندوستان کے اندر شدید مزاحمت کے باوجود انہوں نے جلد ہی ڈاک اور تار کا نظام بحال کر لیا تھا۔ شملہ اور کلکتہ سے ان کو برابر ہدایات موصول ہونے لگی تھیں۔ شمالی ہندوستان میں ان کی توجہ کا مرکز دلی شہر تھا اور وہ لوگ یہ سوچتے تھے کہ اگر ہم دلی پر قبضہ کر لیں تو بغاوت خود بہ خود سرد پڑ جائے گی۔ (۵۲) چنانچہ دلی فتح کرنے کے لیے شمالی ہندوستان کے مختلف علاقوں سے انگریزی اور دیسی فوج کی تیاری شروع ہو گئی۔ سامان حرب، سپاہ اور راک کی وافر مقدار کے ساتھ ۲۴۔ مئی کو کمانڈر ان چیف جنرل آنسن (General Anso انبالہ سے دلی کی طرف رخصت ہوا۔ (۵۳) مگر راستے میں ۲۷۔ مئی کو ہیضہ سے دم گیا۔ اس کی جگہ ہنری برنارڈ (Henry Bernard) نے کمان سنبھال لی۔ (۵۴) اسی روز یڈیئر ولسن (Brigadiar Wilson) نے میرٹھ سے دلی کی طرف کوچ کیا۔ (۵۵) ۳۰۔ اس کی فوج کے سات سو سپاہیوں نے دلی سے دس میل دور ہندن ندی کے قریب غازی

Scanned by CamScanner

الدین گڑھ میں سہ پہر کو پڑاؤ کیا۔ اس مقام پر دلی کی انقلابی فوج نے تین ہزار سپاہیوں اور توپ خانہ کے ساتھ بھرپور حملہ کر دیا۔ حکمت عملی یہ تھی کہ انگریز سپاہ کو دلی پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں برباد کر دیا جائے۔ دلی کی سپاہ نے توپ خانے کو کامیابی سے استعمال کیا مگر انگریز فوج کی شدید مدافعت اور بعد ازاں جارحانہ حملوں کی تاب نہ لا کر دلی کی فوج نے میدان چھوڑ دیا اور دلی کی طرف پسپا ہو گئی اور اپنے پیچھے پانچ توپیں چھوڑ گئی۔ (۵۶) دلی کی فوج نے انگریزوں کو روکنے کے لیے دوسرا دفاعی مورچہ دلی سے پانچ میل دور سرائے بدلی میں قائم کیا۔ درحقیقت یہ فیصلہ کن مقام تھا اگر انگریز یہاں شکست کھا جاتے تو پھر کچھ عرصہ کے لیے فتح دلی کا خواب ادھورا رہ سکتا تھا۔ مگر وہ لوگ نہایت منظم طور پر پورے حوصلے کے ساتھ آگے بڑھنے پر تلے ہوئے تھے۔

۷۔ جون کو کیپٹن ہوڈسن (Captain Hodson) ایک مختصر فوجی جیش کے ساتھ حالات کا جائزہ لینے کے لیے نکلا تھا اور وہ قلعہ کی دیوار کے قریب تک جا پہنچا تھا۔ اسی کی رپورٹ پر انگریز فوج نے آنے والے دنوں کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ (۵۷) ۸۔ جون کو دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ دلی کے لشکر نے جان توڑ کر جنگ کی۔ توپچیوں نے عمدہ اور صحیح گولہ باری کی۔ مگر انگریز فوج کے اچانک حملے سے ان کے قدم اکھڑ گئے اور کوئی ایک گھنٹے کے بعد انقلابی پا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ ان کو کافی جانی نقصان ہوا۔ یہ کہا جاتا تھا کہ دلی کی فوج کے ایک ہزار ہی واپس لوٹ کر نہ آسکے اور کئی سو شدید زخمی ہوئے۔ (۵۸) دلی کی ہزیمت خوردہ فوج مایوسی الت میں شہر میں لوٹی مگر اس حالت میں بھی ان کے اندر سپاہیانہ شان قائم تھی۔ ان کے ایک عینی شاہد کے مطابق:

”میں نے دیکھا کہ زخمی بکثرت شہر میں آ رہے ہیں۔ ایک ایک زخمی کے ہمراہ تین تین چار چار پوربیے لپٹے ہوئے اسے لیے چلے آتے ہیں۔ ڑک پر خون گرتا چلا جاتا ہے۔ تمام سڑک گلرنگ ہو رہی ہے اور خون کی شان بنتی چلی آتی ہے۔ جیسے ہولی میں زمین پر رنگ گرتا ہے۔ دو سوار

Scanned by CamScanner

میرے برابر سے نکلے میں نے دیکھا کہ ان کے سینوں پر گولیاں لگی ہوئی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے اور پشت پر بھالے کے کھلے ہوئے تھے اور کلیجے اور پھیپھڑے کے ٹکڑے اور خون کے لچھے پر چے پڑے تھے۔ دائیں ہاتھوں میں ان کے تیغے اور بائیں ہاتھوں میں گھوڑوں کی باگیں تھیں اور کسی طرح کا کرب اور بدحواسی ان کے بشرے سے ظاہر نہیں تھی۔ اچھی خاصی طرح ان کے ہوش و حواس قائم تھے اور آپس میں باتیں کرتے چلے آتے تھے۔ مجھے آج تک اس امر کا تعجب ہے کہ اتنی دیر تک وہ زندہ اور سلامت کیوں کر رہے اور پانچ کوس تک زندہ کیوں کر چلے آئے۔ اس کے بعد ایک سوار گھوڑے کو بگٹٹ دوڑائے چلا آتا تھا اور گھوڑے کی پیشانی پر گراب کے کاری زخم تھے اور خون اس میں سے اس طرح گرتا ہوا آتا تھا جیسے کہ لوٹے کی ٹونٹی سے پانی گرتا ہے اور اس کا تمام ماتھا اور تھوتھنی وغیرہ خون میں سرخ تھی۔ اس کے پیچھے ایک زخمی کو دیکھا کہ اس کا ہاتھ کہنی پر سے اڑ گیا تھا اور کٹے ہوئے بازو سے خون گرتا چلا آتا تھا اور اپنے پاؤں سے چلا آتا تھا اور دو ایک پوربیے اس سے کہتے ہوئے آتے تھے کہ ہم تم کو ہاتھوں پر اٹھا کر ڈیرے پہنچا دیں تو وہ کہتا تھا کہ نہیں میرے پاس نہ آؤ غرض کہ اسی طرح مجھے قلعہ پہنچنے تک صدہا زخمی سوار پیدل ملے''۔(۵۹)

سرائے بدلی کی جنگ کے بعد انگریز فوج کے لیے دلی جانے کا راستہ صاف تھا۔ ان لوگوں کا منصوبہ یہ تھا کہ جس قدر بھی جلد ممکن ہو سکے دھیرج پہاڑی (The Ridge) پر اپنی چھاؤنی تک پہنچ جانا چاہیے۔ پہاڑی پر دلی فوج کا توپ خانہ موجود تھا۔ دفاع کے لیے سپاہی تھے۔ مگر یہ لوگ مختصر سی جھڑپوں کے بعد اپنا قبضہ چھوڑ کر شہر پناہ کے اندر جا پہنچے۔ ۸۔ جون کو صبح

Scanned by CamScanner

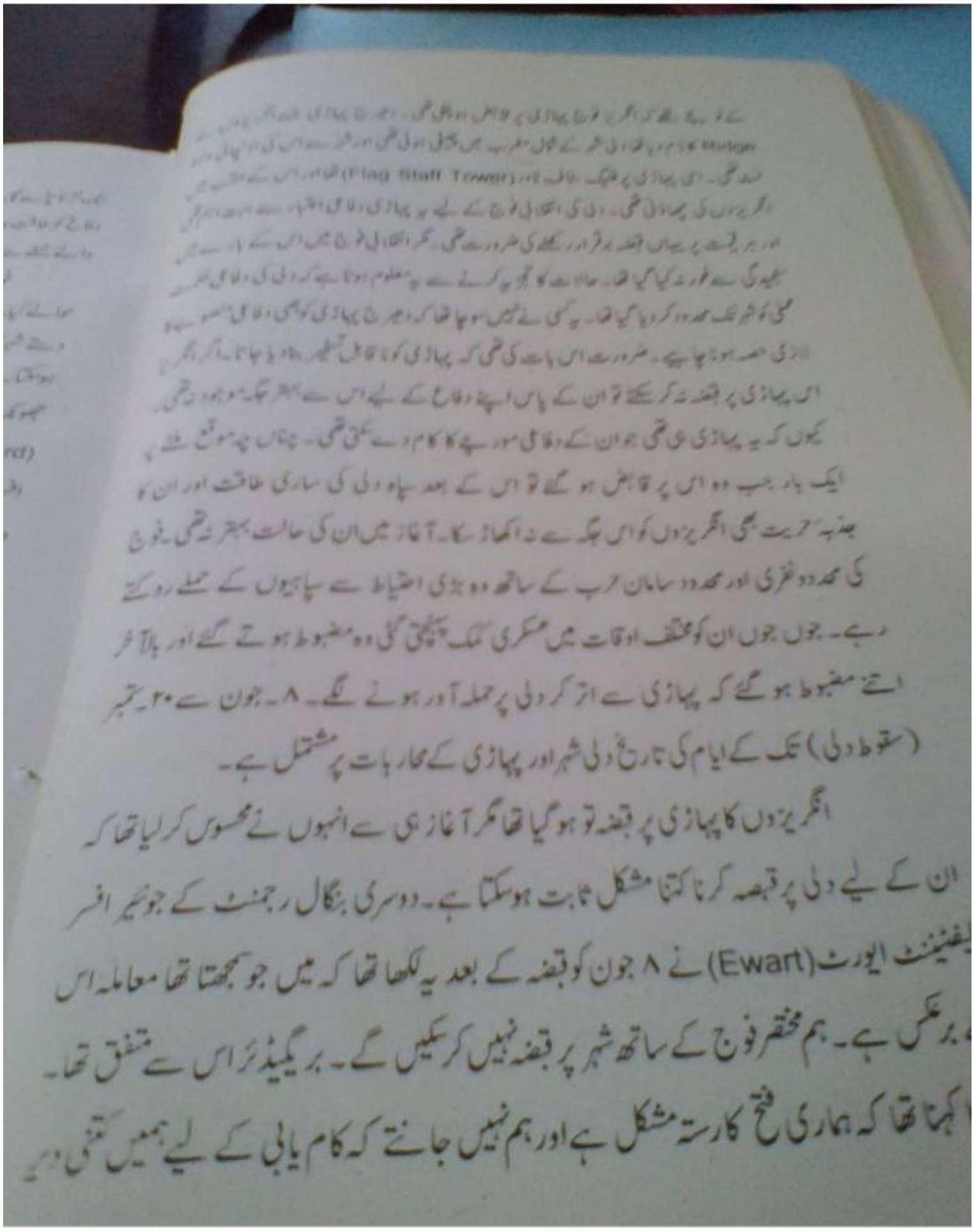

سے کو بھاگ نکلے کہ انگریز فوراً پہاڑی پر قابض ہو گئی تھی۔ دھیرج پہاڑی جسے انگریزوں نے
Ridge کا نام دیا تھا دلی شہر کے شمال مغرب میں پھیلی ہوئی تھی اور شہر سے اس کی اونچائی
ساٹھ فٹ تھی۔ اسی پہاڑی پر فلیگ اسٹاف ٹاور (Flag Staff Tower) تھا اور اس کے عقب میں
انگریزوں کی چھاؤنی تھی۔ دلی کی انقلابی فوج کے لیے یہ پہاڑی دفاعی اعتبار سے بہت اہم تھی
اور ہر قیمت پر یہاں قبضہ برقرار رکھنے کی ضرورت تھی۔ مگر انقلابی فوج میں اس کے بارے میں
سنجیدگی سے غور نہ کیا گیا تھا۔ حالات کا تجزیہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دلی کی دفاعی حکمت عملی
کو شہر تک محدود کر دیا گیا تھا۔ یہ کسی نے نہیں سوچا تھا کہ دھیرج پہاڑی کو بھی دفاعی منصوبے کا
لازمی حصہ ہونا چاہیے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ پہاڑی کو ناقابل تسخیر بنا دیا جاتا۔ اگر انگریز
اس پہاڑی پر قبضہ نہ کر سکتے تو ان کے پاس اپنے دفاع کے لیے اس سے بہتر جگہ موجود نہ تھی۔
کیوں کہ یہ پہاڑی ہی تھی جو ان کے دفاعی مورچے کا کام دے سکتی تھی۔ چناں چہ موقع ملتے ہی
ایک بار جب وہ اس پر قابض ہو گئے تو اس کے بعد سپاہ دلی کی ساری طاقت اور ان کا
جذبۂ حریت بھی انگریزوں کو اس جگہ سے نہ اکھاڑ سکا۔ آغاز میں ان کی حالت بہتر نہ تھی۔ فوج
کی محدود نفری اور محدود سامان حرب کے ساتھ وہ بڑی احتیاط سے سپاہیوں کے حملے روکتے
رہے۔ جوں جوں ان کو مختلف اوقات میں عسکری کمک پہنچتی گئی وہ مضبوط ہوتے گئے اور بالآخر
اتنے مضبوط ہو گئے کہ پہاڑی سے اتر کر دلی پر حملہ آور ہونے لگے۔ ۸۔ جون سے ۲۰۔ ستمبر
(سقوط دلی) تک کے ایام کی تاریخ دلی شہر اور پہاڑی کے محاربات پر مشتمل ہے۔

انگریزوں کا پہاڑی پر قبضہ تو ہو گیا تھا مگر آغاز ہی سے انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ
ان کے لیے دلی پر قبضہ کرنا کتنا مشکل ثابت ہو سکتا ہے۔ دوسری بنگال رجمنٹ کے جونیئر افسر
لیفٹیننٹ ایورٹ (Ewart) نے ۸ جون کو قبضہ کے بعد یہ لکھا تھا کہ میں جو سمجھتا تھا معاملہ اس
کے برعکس ہے۔ ہم مختصر فوج کے ساتھ شہر پر قبضہ نہیں کر سکیں گے۔ بریگیڈیئر اس سے متفق تھا۔
وہ کہتا تھا کہ ہماری فتح کا رستہ مشکل ہے اور ہم نہیں جانتے کہ کام یابی کے لیے ہمیں کتنی دیر

کمک آ جانے سے قبل پہاڑی پر موجود جونیئر افسروں کا ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ باغی سپاہ کے اندر دفاع کو طاقتور ہو جانے سے پہلے ہی دلی پر حملہ کر دینا چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ یکا یک ہونے والے حملے سے سب کچھ ممکن ہو سکتا ہے۔(۶۱)

فوجی انجینئروں نے اس قسم کا ایک منصوبہ بنا کر جنرل برنارڈ (Barnard) کے حوالے کیا۔ فوج کے مختلف افسروں نے یہ رائے دی کہ اگر اس قسم کے حملے سے ہمارے فوجی دستے شہر کا محاصرہ توڑ کر اندر داخل ہو جائیں تو مزید کمک پہنچنے سے پہلے ہی ان کا صفایا ممکن ہو سکتا ہے۔ دو ہزار پیدل فوج کے دستوں کے لیے یہ کام دشوار ہوگا۔ چوں کہ تمام فوج حملے میں جھونک دی جائے گی اس لیے خالی رہ جانے والی چھاؤنی غیر محفوظ ہو جائے گی۔ بالآخر برنارڈ (Barnard) کو یہ منصوبہ سردست ملتوی کرنا پڑا اور وہ کمک کا انتظار کرنے لگا لیکن پہاڑی کے افسروں میں روز و شب دلی پر حملے کے لیے بات چیت جاری رہتی تھی اور ایک عام تاثر یہ تھا کہ دلی کا دوبارہ حصول روز بہ روز مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ ان حالات میں جنرل برنارڈ سخت تھکاوٹ، مسائل کے فکر اور نیند کی کمی کے باعث ہیضہ کا شکار ہو کر مر گیا۔ اب کمان بریگیڈیر ولسن (wilson) کے سپرد ہوئی۔ وہ جب دلی کی طرف دیکھتا تھا تو جنرل برنارڈ کی طرح یہ سوچتا تھا کہ مختصر فوجی طاقت کے ساتھ وہ دلی پر کبھی بھی قبضہ نہ کر سکے گا۔

کیتھ (Keith) نے ۲۹۔ جون کے ایک مکتوب میں یہ لکھا ہے کہ بہت سے لوگ یہ الزام لگاتے ہیں کہ دلی شہر پر قبضہ کرنے کے لیے حملہ نہیں کیا گیا، حالاں کہ یہ حملہ دیر سے متوقع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مٹھی بھر سپاہ کے ساتھ دلی جیسے قلعہ بند شہر پر حملہ کرنا جو ہزاروں مسلح سپاہیوں کے دفاع میں ہے پاگل پن ہے اور یہی رائے برطانوی کیمپ کے افسروں کی ہے۔ شہر کی ایک لاکھ سے زیادہ آبادی ہمیں نقصان پہنچنے کی صورت میں ہمارے خلاف اٹھ سکتی ہے۔(۶۲)

دلی شہر کی فصیل سات میل تھی۔ گیارہ دروازے تھے جو پوری طرح مسلح تھے۔ چوبیس

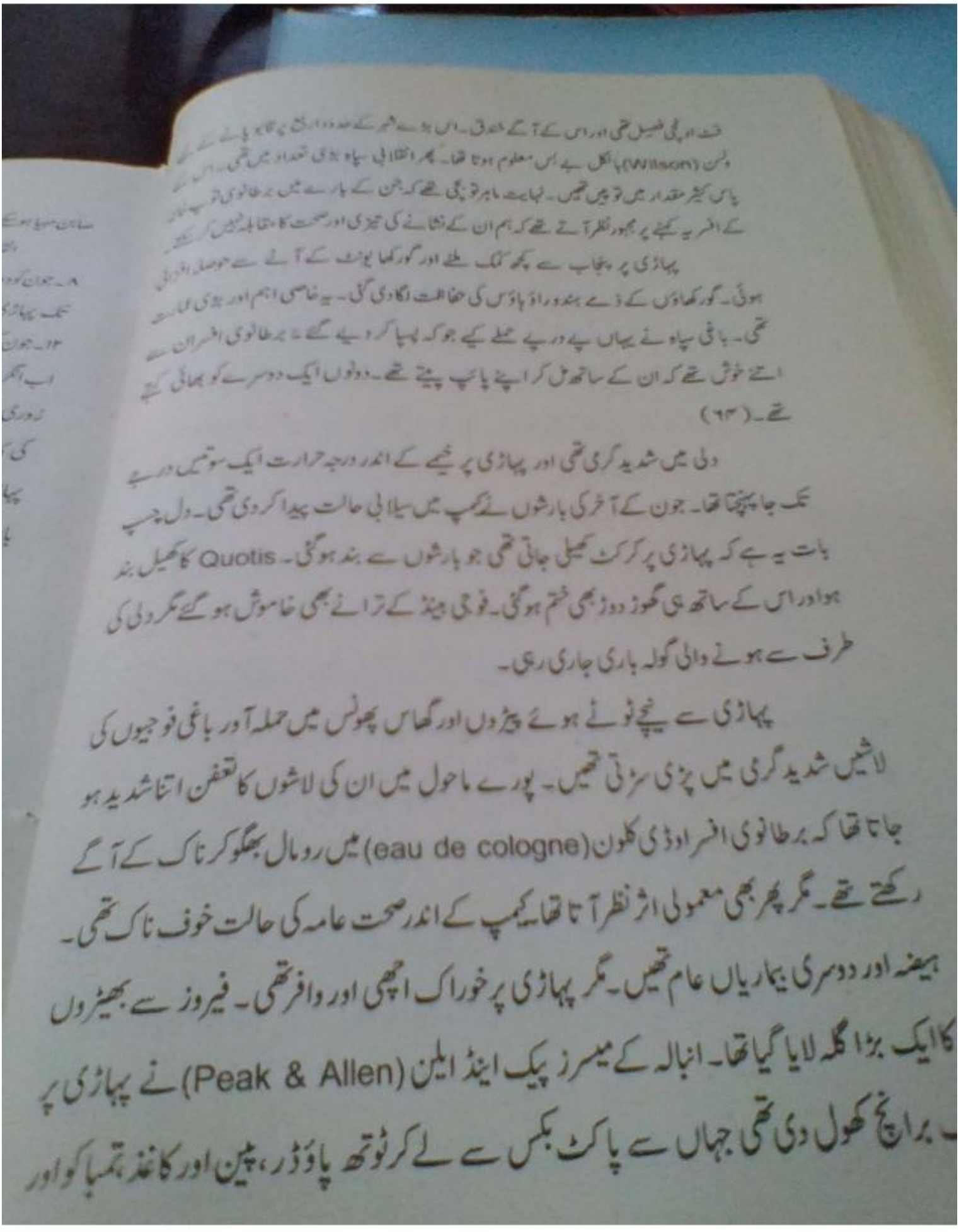

فٹ اونچی فصیل تھی اور اس کے آگے خندق۔ اس بڑے شہر کے محدود رقبے پر قابو پانے کے لیے ولسن (Wilson) بالکل بے بس معلوم ہوتا تھا۔ پھر انقلابی سپاہ بڑی تعداد میں تھی۔ ان کے پاس کثیر مقدار میں توپیں تھیں۔ نہایت ماہر توپچی تھے کہ جن کے بارے میں برطانوی توپ خانہ کے افسر یہ کہنے پر مجبور نظر آتے تھے کہ ہم ان کے نشانے کی تیزی اور صحت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

پہاڑی پر پنجاب سے کچھ کمک ملنے اور گورکھا یونٹ کے آنے سے حوصلہ افزائی ہوئی۔ گورکھاؤں کے ذمے ہندو راؤ ہاؤس کی حفاظت لگادی گئی۔ یہ خاصی اہم اور بڑی عمارت تھی۔ باغی سپاہ نے یہاں پے در پے حملے کیے جو کہ پسپا کر دیے گئے۔ برطانوی افسران ان سے اتنے خوش تھے کہ ان کے ساتھ مل کر اپنے پائپ پیتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو بھائی کہتے تھے۔ (۶۳)

دلی میں شدید گرمی تھی اور پہاڑی پر خیمے کے اندر درجہ حرارت ایک سو تیس درجے تک جا پہنچتا تھا۔ جون کے آخری بارشوں نے کیمپ میں سیلابی حالت پیدا کر دی تھی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ پہاڑی پر کرکٹ کھیلی جاتی تھی جو بارشوں سے بند ہوگئی۔ Quotis کا کھیل بند ہوا اور اس کے ساتھ ہی گھوڑ دوڑ بھی ختم ہوگئی۔ فوجی بینڈ کے ترانے بھی خاموش ہو گئے مگر دلی کی طرف سے ہونے والی گولہ باری جاری رہی۔

پہاڑی سے نیچے ٹوٹے ہوئے پیڑوں اور گھاس پھونس میں حملہ آور باغی فوجیوں کی لاشیں شدید گرمی میں پڑی سڑتی تھیں۔ پورے ماحول میں ان کی لاشوں کا تعفن اتنا شدید ہو جاتا تھا کہ برطانوی افسر او ڈی کلون (eau de cologne) میں رومال بھگو کر ناک کے آگے رکھتے تھے۔ مگر پھر بھی معمولی اثر نظر آتا تھا۔ کیمپ کے اندر صحت عامہ کی حالت خوف ناک تھی۔ ہیضہ اور دوسری بیماریاں عام تھیں۔ مگر پہاڑی پر خوراک اچھی اور وافر تھی۔ فیروز سے بھیڑوں کا ایک بڑا گلہ لایا گیا تھا۔ انبالہ کے میسرز پیک اینڈ ایلن (Peak & Allen) نے پہاڑی پر برانچ کھول دی تھی جہاں سے پاکٹ بکس سے لے کر ٹوتھ پاؤڈر، پین اور کاغذ تمباکو اور

Scanned by CamScanner

سامان مہیا ہو سکتے تھے۔ بیر کی بوتلیں کثرت سے دستیاب تھیں۔(۶۵)

انقلابی فوج نے انگریزوں کو پہاڑی سے اکھاڑنے کے لیے مسلسل کوششیں کیں۔

۸۔ جون کو دوپہر کے بعد دو بجے انہوں نے ایک بھرپور حملہ کیا جو کامیاب نہ ہو سکا۔ شام ۵ بجے تک پہاڑی کیمپ توپوں کی گھن گرج سے خاموش ہو چکا تھا۔ انقلابی واپس جا چکے تھے۔(۶۶)

۱۲۔ جون کو بھی انہوں نے انگریزی کیمپ کے دائیں بازو پر جان توڑ حملہ کیا مگر ناکام رہا۔(۶۷)

اب انگریز فوج کو بہ خوبی طور پر احساس ہو گیا کہ وہ توپ خانے اور انجینئرنگ کے وسائل کی کم زوری کے باعث دلی نہیں لے سکتے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ انقلابیوں کی توپیں اور ان کی کارکردگی برطانوی کیمپ سے برتر تھی۔ انقلابیوں کی طرف سے حملے جاری رہتے تھے اور پہاڑی سے جوابی گولہ باری کا سلسلہ معمول کے مطابق جاری رہتا تھا۔ ان جنگی محاربات کے بارے میں ہم ایک ہم عصر شہادت پیش کرتے ہیں جس سے اس جنگی فضا کا منظر کھنچ جاتا ہے:

"پہاڑی پر فریزر صاحب کی کوٹھی سے لگا کر باؤلے تک انگریزی فوج کے مورچے لگے ہوئے تھے ادھر کشمیری دروازہ کے برج سے لے کر کابلی دروازہ کے سیاہ برج اور لاہوری دروازہ کے برج فراش خانہ کی کھڑکی کے برج تک توپیں چڑھی ہوئی تھیں اور باہم شبانہ روز گولہ باری ہوتی تھی اور شیل اور بم کے گولے شہر پر برستے تھے۔ بم کا گولہ خدا پناہ رکھے جس وقت پھٹتا تھا اور صدہا ٹکڑے اس کے اڑ جاتے تھے اگر سات درجہ کے مکان پر پڑا تو نہ کو اتر گیا اور سب کا ستیاناس کر دیا اگر زمین پر پڑا تو دس گز زمین پیوست ہو کر پھوٹا اور تمام مکان کو اڑا دیا۔ غرض کہ ایک قہر خدا تھا۔ دس دس گولہ برابر کاغذ کے پرچوں کی طرح شب کو اڑتے چلے آتے تھے اور برابر پھٹتے چلے جاتے تھے ادھر صبح ہوئی اور بگل بجنے شروع ہوئے اور فوج باغیہ کمر بندی کر کے لاہوری دروازہ

Scanned by CamScanner

کے باہر جاسوس موجود ہوئی اور باہم گولی چلنے لگی۔ شام تک میدان داری رہی
پھر اپنے اپنے ڈیروں پر آ موجود ہوئے۔"(۶۹)

برطانوی فوج ہر قسم کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے سراغ رسانی کے لیے بھی
توجہ صرف کر رہی تھی۔ پہاڑی پر ولیم ہوڈسن (William Hodson) نے خفیہ خبر رسانی کے
محکمہ کو بڑی چابک دستی سے چلا رکھا تھا۔ اس کے سپاہی مطلوبہ معلومات کے حصول کے لیے ہر
روز پہاڑی سے شہر میں جاتے اور وہاں سے تازہ ترین خبریں اپنے مقرر کردہ جاسوسوں سے لے
کر آتے تھے۔ جولائی کے وسط میں یہ خبریں آنے لگی تھیں کہ باغی سپاہی واپس بھی جا رہے ہیں
ان کی تعداد ایک تہائی تک کم ہو چکی ہے۔ شہر والے ان سے پریشان ہیں۔ تنخواہوں کے مسئلے
ہیں اور بارود کی قلت ہو رہی ہے۔ ان خبروں سے متاثر ہو کر ہوڈسن (Hodson) دلی پر جلد از
جلد حملہ کرنے کی ترغیب دے رہا تھا مگر افسروں کی رائے یہ تھی کہ اس قسم کے حملے کا وقت گزر چکا
تھا۔(۷۰) برطانوی فوج سے لندن میں یہ توقعات کی جا رہی تھیں کہ وہ جلد سے جلد دلی پر قبضہ
کر لے گی، مگر یہاں حالت یہ تھی کہ انقلابی سپاہ کی مدافعت اور جارحیت زوروں پر تھی جس کے
باعث پہاڑی پر حالات مشکل ہو رہے تھے۔ ۲۷۔ جولائی کو انجینئرنگ کور کا افسر آرتھ موفٹ
لینگ (Arthur moffat lang) لاہور سے دلی پہنچا تو اسے یہ محسوس ہوا کہ دلی فیلڈ فورس
(Delhi Field Force) کی حالت یہ ہے کہ وہ دلی کا محاصرہ کرنے کی جگہ خود محصور ہو
گئی ہے۔(۷۱)

ولسن (Wilson) کے اپنے خیالات بدل رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس طرح
پہاڑی پر متمکن رہنے میں کیا دانائی ہے۔ وہ اپنی افواج کی واپسی کے امکانات کا جائزہ بھی لے
رہا تھا۔ وہ اس فوج کو ملک کے دیگر حصوں میں استعمال کرنے کے حق میں تھا۔ اس کے سٹاف
کے افسر اس رائے کے حامی بھی تھے مگر بیرڈ سمتھ (Baird Smith) اس بات پر قائم تھا کہ
دلی کو چھوڑنا اور پنجاب کے ساتھ مواصلات کو ختم کرنا ایک بڑی غلطی ہے۔(۷۲) وہ اس بات

Scanned by CamScanner

یہ مسلسل زور دیتا رہا تا آں کہ ۱۴ اگست کو پنجاب سے کمک پہنچ گئی اور اس کے ساتھ بریگیڈیئر نکلسن (Nicholson) بھی تھا جس نے پہاڑی کے دل شکستہ ماحول کو یکسر بدل کر رکھ دیا اور اس کی آمد کے ساتھ ہی انگریزوں کے کیمپ میں دلی پر قبضے کا خواب حقیقت بنتا ہوا نظر آنے لگا۔ جان نکلسن (John Nicholson) کے ساتھ ۴۲۰۰ سپاہیوں کا لشکر آیا تھا۔ وہ ایک سخت جان افسر تھا اس کا کہنا تھا کہ غدر "جونک کی طرح" ہے اسے جتنی جلدی ممکن ہو کچل دینا چاہیے۔ (۳۷) وہ باغی سپاہیوں کی کھال کھنچوانے اور ان کو چار چوب کرنے کے لیے مشہور تھا۔

پہاڑی پر برطانوی کیمپ کو مسلسل کمک پہنچ رہی تھی۔ ۳۔ ستمبر کو ہاتھیوں کا ایک قافلہ بھاری توپوں کے ساتھ آ پہنچا۔ یہ توپیں دلی شہر کا دفاع توڑنے کے لیے منگوائی گئی تھیں۔ بارود کے کثیر ذخائر بھی سامان رسد کا حصہ تھے۔ اس اہم امداد کے باوجود برطانوی فوج کا کمان دار آرچڈیل ولسن (Archdale Wilson) متذبذب تھا کہ حملہ کرے یا نہ کرے وہ حملے کی ناکامی کے باعث ہونے والی تباہی سے خوف زدہ تھا۔ آخر کار دلی پر حملہ کا پروگرام تیار کر لیا گیا۔ یہ منصوبہ طے ہوا کہ فصیل شہر کا وہ حصہ جو برطانوی کیمپ سے نزدیک تھا اسے توپ خانے اور بارودی سرنگوں کی مدد سے اڑا دیا جائے اور جوں ہی موقع ملے فوج فصیل کے شگافوں سے شہر میں داخل ہو جائے۔

اب صورت یہ تھی کہ ادھر تو پہاڑی پر برطانوی کیمپ فیصلہ کن حملے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ یہ لشکر ہر قسم کے ہلکے اور بھاری ہتھیاروں سے مکمل طور پر لیس ہو چکا تھا۔ بڑھتے بڑھتے ان کی فوج کی تعداد ۱۳۰۰۰ ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ ان کی قیادت نہایت شاطر افسروں کے سپرد تھی اور وہ تن من کی بازی لگا کر دلی فتح کرنے کا منصوبہ تیار کر چکے تھے اس کے عین برعکس اس دور میں بہادر شاہ کی حکومت اور انقلابی فوج بدترین مسائل کا سامنا کر رہی تھی۔

اگست کے آخری ایام میں بہادر شاہ کی حکومت شدید مسائل میں الجھ گئی تھی اور ستمبر کے شروع سے اس حکومت کا الم ناک انجام صاف طور پر نظر آنے لگا تھا۔ یہ وہ دن تھے جب

Scanned by CamScanner

کا ایک حصہ شہزادے خرد برد کر جاتے ہیں۔ اس لیے بہادر شاہ نے یکم ستمبر کو مجبور ہو کر یہ اعلان کیا تھا کہ شہزادوں کو چندہ نہ دیا جائے۔ اگست کے وسط میں فوجیوں کا ایک گروہ مرزا مغل کو تنخواہ کی عدم ادائیگی کی بنا پر قتل کرنے گیا تھا اور شہزادہ وہاں سے فرار ہو گیا تھا۔ ۶۔ ستمبر کی ایک رپورٹ کے مطابق بریلی کی فوج تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے کافی ہنگامہ کر رہی تھی۔

بہادر شاہ کی سپاہ کے لیے گولہ بارود کی فراہمی بھی مسئلہ بنی رہی۔ بارود ہر روز استعمال ہوتا تھا اور دلی شہر میں بنایا جاتا تھا۔ ایک بڑا المیہ یہ ہوا کہ ۸۔ اگست کو انقلابی فوج کا بارود خانہ دھماکہ سے برباد ہو گیا۔ یہ بارود خانہ بیگم سمرو کی حویلی میں تھا جو چوڑی والاں میں واقع تھی۔ وہاں سات سو من بارود ہر روز تیار ہوتا تھا۔ ۸۔ اگست کی سہ پہر کو اچانک دھماکہ ہوا جس سے کارخانے میں کام کرنے والے سات سو کاری گر دھماکے کی نذر ہو گئے تھے۔ (۷۵) اگست کے وسط میں صورت یہ تھی روپے پیسے کی کمی کے سبب بارود خانہ بند پڑا تھا جو کچھ گولہ بارود وہاں

تھا وہ بھی خراب ہو رہا تھا مگر اگست کے آخر میں بارود خانہ نے دوبارہ کام شروع کر کے پچاس من بارود روزانہ تیار کرنا شروع کر دیا تھا اور یہ صرف ایک روز کے استعمال کے لیے تھا۔ (۷۶) یکم ستمبر کو یہ خبر ملتی ہے کہ گندھک کی شہر میں شدید قلت ہے اس لیے بارود سازی رک گئی۔ (۷۷)۔ ستمبر کا مہینہ فیصلہ کن جنگ کا مہینہ تھا مگر اس مہینے میں بارود کی کمی تھی۔ انگریز دلی پر آخری بڑے حملے کے لیے مورچے بھر رہے تھے اور ۱۳۔ ستمبر کو جنرل بخت خان کے پاس بارود ختم ہو چکا تھا اور وہ توپ خانہ کی کمان سے اپنی بڑی توپ کے لیے گولہ بارود حاصل کرنے کے لیے التجائیں کر رہا تھا۔ اس کی بڑی توپ بے کار کھڑی تھی۔ یہ توپ کشمیری دروازے تک مار کرتے ہوئے انگریزوں کے حملے کو پسپا کرتی تھی۔ (۷۸) اس توپ کے خاموش رہنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز فوج کشمیری دروازے کی فصیل پہ گولہ باری کر کے ایک بڑا شگاف ڈالنے میں کام یاب ہو گئی تھی اور اسی شگاف سے بعد ازاں وہ لوگ شہر میں داخل ہوئے تھے۔

تنخواہوں کے نہ ملنے کے سبب انقلابی سپاہی بد دل ہو کر آہستہ آہستہ فرار کا رستہ اختیار کرتے گئے۔ ایک اور رپورٹ کے مطابق شہر میں صرف پندرہ توپیں باقی بچی تھیں۔ ان میں سے چھ بریلی بریگیڈ کے پاس، پانچ نصیر آباد بریگیڈ کے پاس اور چار بادشاہ کے ذاتی دستے کے پاس تھیں۔ بارود خانہ میں تقریباً ساٹھ من کچا بارود باقی تھا۔ گندھک کی از بس قلت مسئلہ بن گئی تھی جو بارود بن رہا تھا وہ معیاری نہ تھا۔ اس لیے کوئل کے بارود سازوں کو بلایا جا رہا تھا تا کہ وہ یہاں آ کر بہتر قسم کا بارود تیار کر سکیں۔ (۷۹) ۱۶۔ اگست تک صرف چار دنوں میں تین ہزار سپاہی فرار ہو گئے تھے۔ فرار ہونے کا یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا۔ سپاہی فقیروں اور بیراگیوں کا بھیس بدل کر بھی بھاگنے سے گریز نہ کرتے تھے۔ (۸۰) سقوط دلی کے دنوں میں سپاہی تیزی سے شہر چھوڑ کر جا رہے تھے۔ صرف ۱۵۔ ستمبر کو پوربی سپاہیوں کی دو پلٹنیں فرار ہو کر ریواڑی کی طرف چل دیں۔ (۸۱) ایک دوسرے ریلے میں ۴۰۰ سوار رہتک کی جانب جا رہے تھے۔ (۸۲) بھاگنے والے سپاہیوں کی وجہ سے دلی کی فوج بد دل ہو رہی تھی۔

Scanned by CamScanner

مالی مشکلات، بارود کی قلت، تنظیم کی کمی اور قائدانہ صلاحیتیں میسر نہ ہونے کی [illegible] سپاہ دلی کو بار بار ہزیمت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ فوج کے اندر اتفاق اور قیادت کو تسلیم [illegible] کا جذبہ نہ تھا۔ سردار باہمی رقابتوں اور کم تر درجے کی سیاست کا شکار تھے۔ وہ لوگ [illegible] حکم ماننے سے گریز کرتے تھے۔ سپہ سالار جنرل بخت خان کے احکام کی پروا نہ کرتے [illegible] سپاہی شہزادہ مرزا مغل کو بھی شک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ان کے خیال میں مرزا مغل [illegible] چاہتا تھا کہ دلی سے تمام افواج کو باہر بھیج دے اور جب دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے فوج [illegible] وہ خود انگریزوں سے جا ملے اور انگریزی فوج شہر میں داخل ہو جائے اور صلے میں اسے دلی کا بادشاہ مقرر کر دیا جائے۔ اس الزام کے سلسلے میں ایک تحقیقاتی کمیٹی کا اجلاس بھی [illegible] تھا۔ (۸۳) ستمبر کے نازک ترین ایام میں اندرونی طور پر فوج کی حالت یہ تھی کہ تفرقہ پیدا ہو [illegible] نصیر آباد اور نیمچ بریگیڈ شہزادہ مرزا مغل کے ساتھ تھے۔ بخت خان کے بریلی بریگیڈ کے افسر اور مرزا مغل جانی دشمن بنے ہوئے تھے۔ اس بات کا بھی امکان ظاہر کیا جا رہا تھا کہ شاید بریلی فوج کے افسر مرزا مغل کو قتل کر دیں۔ (۸۴)

۱۱۔ مئی ۱۸۵۷ء سے قبل بہادر شاہ ظفر کو کمپنی کی طرف سے پنشن کے علاوہ دیگر مراعات بھی حاصل تھیں۔ ۱۱۔ مئی کے بعد پنشن اور مراعات کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ آنے والے دنوں میں بہادر شاہ نے عیش و آرام کے ان دنوں کی مسرت کو یاد کیا۔ اسے اس بات کا قلق تھا کہ سپاہیوں نے اسے خواہ مخواہ مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ اگر اس کا بس چل سکتا اور یہ ممکن بھی ہوتا تو وہ انگریزوں سے صلح کرنے میں گریز نہ کرتا۔ مگر انقلابی فوج نے اسے ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا تھا اور یہ بادشاہت اس کے لیے عذاب بن گئی تھی۔ سپاہیوں اور سرداروں کی نافرمانی، فوج کی نااتفاقی، مالی مشکلات کے آشوب اور دیگر مسائل نے اسے از بس دل گرفتہ کر دیا تھا۔ سپاہی ہر روز تنخواہ کا مطالبہ کرتے تھے اور خزانہ خالی تھا۔ بہادر شاہ نے ہر ممکن حد تک ان کے مالی مطالبات پورے کیے مگر آخر آخر وہ انتہائی طور پر اعصاب زدہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے انجام کی تصویر

Scanned by CamScanner

پر خوبی طور پر دیکھ چکا تھا۔ اس لیے ذہنی طور پر وہ بالکل شکست خوردہ انسان نظر آنے لگا تھا۔ حالات کے جبر کے ہاتھوں وہ بے حد مجبور اور مکمل طور پر لاچار ہو گیا تھا۔ شکست سے دو ہفتے پہلے فوج اور قلعہ کے مابین مالی معاملات کے بڑھتے ہوئے تنازعات معمول بن چکے تھے۔ ہم ان تنازعات میں سے ایک کا منظر یہاں درج کرتے ہیں۔ یہ منظر نہایت افسوس ناک تھا۔ یہ ۲۔ ستمبر کا واقعہ تھا:

"کچھ افسر اپنی تنخواہ کا مطالبہ کرنے شاہی محل گئے تھے۔ یہاں پر ہر عہدے کے تقریباً پانچ سو افسر، دیوان خاص میں شہزادہ مغل، مرزا ابوبکر اور مرزا خضر سلطان کو گھیرے کھڑے تھے اور بہ آواز بلند کہہ رہے تھے کہ حکیم احسن اللہ خان ان کی تنخواہوں کی ادائیگی میں مداخلت کر رہا ہے۔ وہ شہزادوں کو قید کرنے اور حکیم احسن اللہ خان کو قتل کرنے کی دھمکیاں دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ان کی تنخواہیں نہ دی گئیں تو وہ شہر کو آپس میں تقسیم کر کے لوٹ مار شروع کر دیں گے۔ وہ اپنے مطالبات کو منوانے کے لیے کافی دیر شور مچاتے رہے۔ مرزا مغل نے اپنی جان بچانے کے لیے آخر مرزا الٰہی بخش کو بلا بھیجا۔ وہ ان کو دلاسہ وغیرہ دے کر بادشاہ کے پاس لے گیا۔ بادشاہ نے کہا کہ اس کے پاس کوئی رقم نہیں ہے کہ وہ ان کو دے سکے۔ اس پر فوج کے افسروں نے دھمکی دی کہ وہ شاہی خاندان کے تمام افراد کو قتل کر کے محل اور شہر کو لوٹ لیں گے۔ یہ سن کر بادشاہ اپنے تخت سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے تخت کی گدی ان افسروں کے سامنے پھینک کر حکم دیا کہ شاہی محل کے تمام نوادرات اور شاہی خاندان کی بیگمات کے زیور ان کے حوالے کیے جائیں۔ اس کے بعد وہ کعبہ کی طرف رخ کر کے رونے لگا اور کہا کہ اسے اپنے گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ اسے بھی اگر انگریزوں کے

Scanned by CamScanner

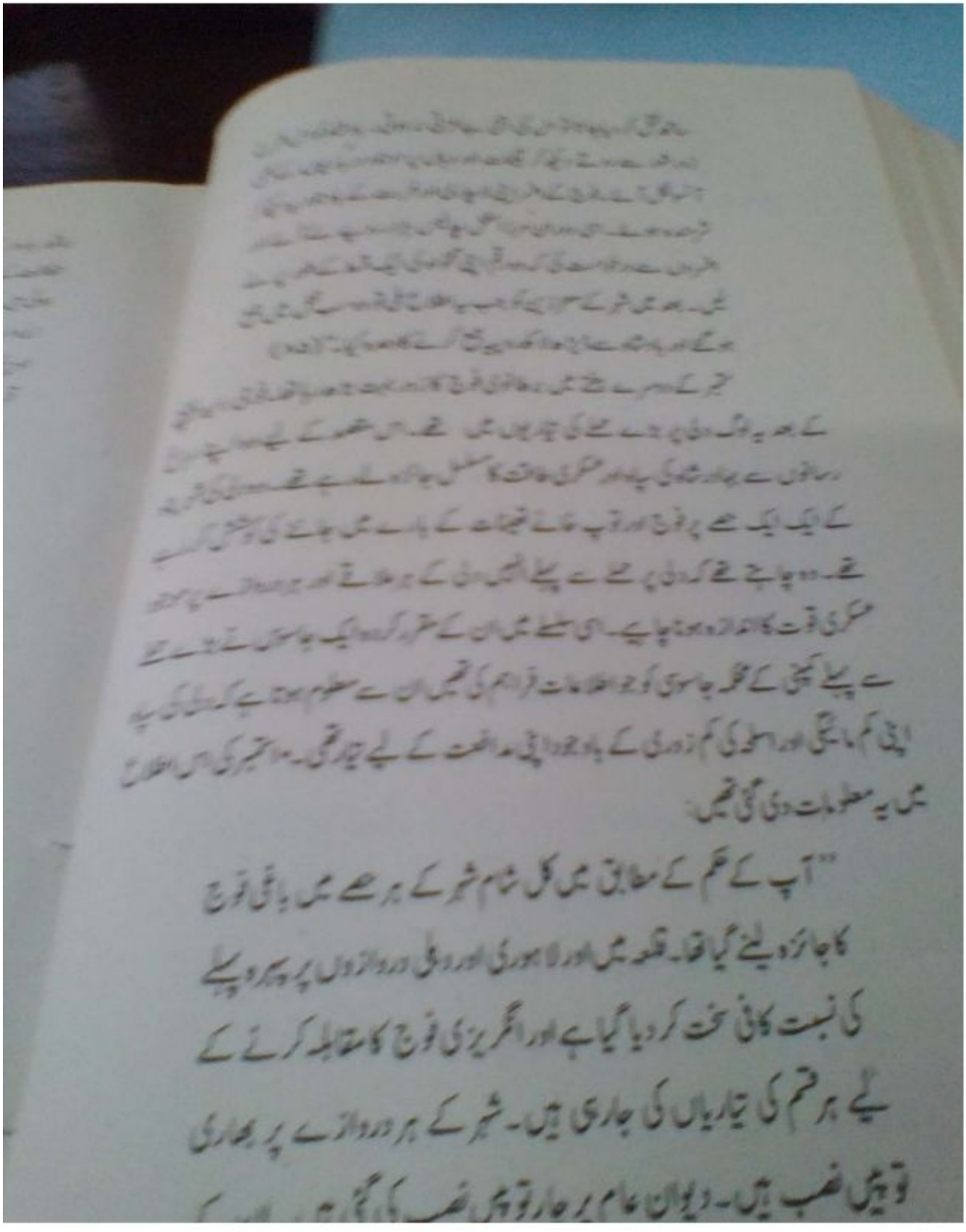

[illegible]

[illegible] کے بعد یہ لوگ دہلی پر دوبارہ حملے کی تیاریوں میں تھے۔ اس مقصد کے لیے [illegible] ذرائعوں سے [illegible] عسکری طاقت کا مسلسل جائزہ لے رہے تھے [illegible] کے ایک ایک حصے پر فوج اور توپ خانے تعینات کے بارے میں جاننے کی کوشش [illegible] تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ دہلی پر حملے سے پہلے انہیں دہلی کے ہر علاقے اور ہر دروازے [illegible] عسکری قوت کا اندازہ ہونا چاہیے۔ اسی سلسلے میں ان کے مخبر [illegible] ایک جاسوس نے [illegible] سے پہلے کمپنی کے محکمہ جاسوسی کو جو اطلاعات فراہم کی تھیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کی سپاہ اپنی کم مائیگی اور اسلحہ کی کمزوری کے باوجود اپنی مدافعت کے لیے تیار تھی۔ [illegible] مخبر کی اس اطلاع میں یہ معلومات دی گئی تھیں:

"آپ کے حکم کے مطابق میں کل شام شہر کے ہر حصے میں باغی فوج کا جائزہ لینے گیا تھا۔ قلعہ میں اور لاہوری اور دہلی دروازوں پر پہرہ پہلے کی نسبت کافی سخت کر دیا گیا ہے اور انگریزی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر قسم کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ شہر کے ہر دروازے پر بھاری توپیں نصب ہیں۔ دیوان عام پر چار توپیں نصب [illegible]

ساتھ بارود کے چار چھکڑے بھی نصب ہیں۔ سلیم گڑھ کے قلعہ کی حفاظت کے لیے مورچہ قائم کیا گیا ہے اس کے چاروں طرف توپیں لگی ہوئی ہیں۔ کشمیری دروازے سے لے کر لاہوری دروازے تک فوج کا زبردست پہرہ ہے۔ سڑک کے دونوں طرف ہر گھر میں نیچے سے لے کر اوپر تک سپاہی جمع ہیں۔ کیولری کی فوج دریا کے کنارے لال ڈگی کے قریب متعین ہیں۔ اس کی ایک بڑی تعداد دہلی دروازے کے قریب شاہی مسجد میں بھی موجود ہے۔ فوج کے کچھ سوار شہر میں بھی گشت کر رہے ہیں۔ شہر کے ہر دروازے پر ایک توپ نصب ہے۔ کشمیری دروازے میں اندر کی طرف چار توپوں کا مورچہ قائم کیا گیا ہے۔

ہر جگہ توپوں کی تعداد پہلے کی نسبت بڑھا دی گئی ہے۔ دیواروں پر پہرہ کی تعداد پہلے کی نسبت بڑھا دی گئی ہے اور پہرہ بھی بڑی مستعدی اور احتیاط کے ساتھ دیا جا رہا ہے۔ شہر میں نہر کے تمام پل قائم ہیں۔ دہلی اور میرٹھ کی رجمنٹیں بھی شہر میں ہیں۔ غازی حملہ کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کھڑے ہیں ان کی اب علیحدہ پلٹن بنا دی گئی ہے۔" (۸۶)

انگریزی فوج کا محکمہ جاسوسی معلومات کے حصول کے لیے کسی ایک ذریعہ ہی پر انحصار نہیں کرتا تھا۔ یہ لوگ مختلف ذرائع سے بھی معلومات حاصل کرتے تھے۔ اپنی حکمت عملی بنانے کے لیے وہ ہر ممکن طریقے سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بالخصوص دلی پر حملے سے عین پہلے وہ بڑی تن دہی سے اس کام میں مصروف تھے اور ان کے جاسوس معلومات حاصل کرنے میں پوری کوشش کر رہے تھے۔ ۱۰ ستمبر کی ایک رپورٹ ہم نے اوپر درج کی ہے۔ اب ۱۰ ستمبر ہی کی ایک اور رپورٹ بھی درج کرتے ہیں۔ جس سے سپاہ دلی کی تیاریوں کا نقشہ سامنے آ جاتا ہے:

Scanned by CamScanner

شہر کے تمام دروازوں خصوصاً ''کشمیری'' کابلی، لاہوری اور اجمیری کو دفاع مضبوط کر دیا ہے اور ان سب پر اب پہلے کی نسبت بڑی نفری پہرہ مقرر ہے۔ انگریزی فوج کی گولہ باری نے کشمیری دروازہ، کابلی دروازے اور پانی پت والے برج کے مورچہ کو خاموش کر دیا ہے۔ شاہی برج بالکل تباہ ہو گیا ہے۔ برج سے لے کر گرجا گھر تک شہر کی دیوار مسمار ہو چکی ہے۔ باغیوں نے کابلی دروازہ کو اینٹوں اور پتھروں سے چن دیا ہے۔ لال دروازے کے صرف پھاٹک بند ہیں۔ قلعہ گھاٹ کے دروازے کا بھی یہی حال ہے بڑی سخت تیاری کی جا رہی ہے۔ مدرسہ غازی الدین خان پر بارہ توپیں چڑھا دی گئی ہیں۔ کل حملہ کی توقع کرتے ہوئے کوتوال کے نزدیک لاہوری دروازے کی طرف جانے والی سڑک پر دو بھاری توپیں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ اور ایک دوسری توپ لالہ ہرنرائن کے گھر پر چڑھا دی گئی تھی لیکن بعد میں ان تینوں توپوں کو وہاں سے ہٹا لیا گیا۔

کشمیری اور لاہوری دروازوں کے درمیان چوراہے پر بھی مورچہ بندی کی جا رہی ہے۔ یہاں پر بھی کچھ بھاری توپیں لا کھڑی کی جائیں گی۔ باغیوں نے شاہی برج کے نیچے ریت کے بوروں کا مورچہ قائم کر لیا ہے۔ شہر کی فصیل میں جو شگاف پڑ گئے تھے انہیں بھی ریت کے بوروں سے بند کر دیا ہے۔ شاہی قلعہ میں فوج کی دو رجمنٹیں موجود ہیں ان میں سے ایک سلیم گڑھ پر پہرہ دینے کے لیے مقرر ہے۔ بادشاہ کا حفاظتی دستہ بھی اور ریگولر کیولری کے دو سو سواروں کے ساتھ قلعہ میں موجود ہے۔ دیوان عام پر تین بھاری توپیں نصب کر دی گئی ہیں۔ قلعہ

Scanned by CamScanner

کی دیوار کے سامنے دہلی اور لاہوری دروازوں پر بھی ایک ایک توپ نصب ہے۔"(۸۷)

۱۲۔ ستمبر کو یہ اطلاع دی گئی ہے کہ باغی سپاہ نے کشمیری دروازے کے اندر سڑک کے دونوں طرف پتھر چن کر مورچے قائم کر لیے ہیں۔ کشمیری اور کابلی دروازے کے درمیان بھی ایک مورچہ قائم ہے۔ شہر کی فصیل پر توپیں لگا دی گئی ہیں۔ ۱۶۔ ستمبر کی ایک رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ بے شمار سپاہی اب بددل ہو کر اپنے گھروں کو جا رہے ہیں۔ باقی فوج دلی میں رہ کر چار دن مسلسل انگریزوں کا مقابلہ کرے گی اس کے بعد وہ اپنے سامان کے پیچھے بھاگ نکلے گی۔ یہ فوج مورچوں سے اپنا سامان نکال کر گوالیار کی طرف روانہ کر چکی ہے۔ اگر انگریزی فوج نے ان کا پیچھا کیا تو ان کا حفاظتی دستہ مقابلہ کرے گا۔ چوں کہ انگریزی فوج پہلے ہی تھکی ہوگی وہ زیادہ دور تک ان کا تعاقب نہ کر سکے گی۔ شاہی قلعہ کی فوج اپنے مورچوں پر لڑ کر جان دینے کے لیے تیار ہے۔(۸۸)

ستمبر ۱۸۵۷ء میں حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ مگر ان ابتر حالات کے باوجود دلی کی فوج میں ایسے دلیر سپاہیوں اور جاں باز افسروں کی کمی نہ تھی جو بھوک ننگ اور آلات حرب کی قلت کے باوجود انگریز فوج سے مرتے دم تک لڑنے کا تہیہ کر چکے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں نے دلی کا دفاع کرنے میں خون کا آخری قطرہ تک بہا دیا تھا۔

انگریزی فوج نے ۸۔ ستمبر کو کشمیری دروازے، موری دروازے اور کابلی دروازے سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر کافی تعداد میں فصیل شکن توپیں نصب کر کے فصیل اور قلعہ پر گولہ باری شروع کر دی تھی۔ ایک طرف سے انگریزی مورچوں کی گولہ باری سے شہر پر آگ برس رہی تھی اور دوسری طرف شہر کے دیواروں سے ان مورچوں پر جواباً آگ برسائی جا رہی تھی۔ میجر ریڈ (Major Reid) کے بہ قول اس نے بنگال آرٹلری کے توپچیوں سے زیادہ نشانہ زن توپچی اپنی زندگی میں نہیں دیکھے تھے۔ یہ وہی توپچی تھے جو شہر کی لرزتی ہوئی دیواروں سے

Scanned by CamScanner

انگریزوں کے مورچوں پر آگ برسا رہے تھے۔ انگریزوں کے بھاری توپ خانے کی
بم باری ۱۳۔ ستمبر تک برابر جاری رہی۔ اس بم باری کا مقصد کشمیری دروازے
میں ایک بڑا شگاف ڈالنا تھا اور یہ مقصد پورا ہو چکا تھا اور ۱۳۔ ستمبر کو پچاس فٹ
نمودار ہو چکا تھا۔ (۸۹) اسی شام کو نکلسن نے انجینئر لینگ (Lang) کو تفصیلی معائنہ
کا حکم دیا۔ رات دس بجے توپ خانہ خاموش ہوا اور لینگ نے معائنہ کر کے تصدیق کی
شگاف کے ذریعے شہر میں داخل ہو سکتی ہے۔ (۹۰) اب شہر پر حملہ شروع کیا گیا یہ حملہ
حملہ آور دستوں نے شروع کیا تھا۔ اس بڑے اور فیصلہ کن حملے کی کمان
(Nicholson) کے سپرد تھی۔ شہر کی فصیلوں اور اندرون شہر سے انقلابی فوج شدید مزاحمت
کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ گولہ بارود کی کمی کے باوجود ان لوگوں نے بڑی جاں بازی کا مظاہرہ
جس سے انگریزی فوج کو نقصان پہنچا۔ ۱۳ ستمبر سے ۱۸ ستمبر تک خوف ناک جنگ کا سلسلہ جاری
رہا۔ ان ایام کے بارے میں ظہیر دہلوی نے چشم دید واقعات قلم بند کرتے ہوئے لکھا ہے:

"لاہوری دروازہ سے لگا کر کابلی دروازہ کی نہر تک تمام تیلی واڑہ کے میدان میں پھیلی ہوئی زمین تھی اور انگریزی فوج کے اور اس کے درمیان فقط ایک نہر حائل تھی اور برابر دونوں طرف سے بندوق کی باڑ جھڑ رہی تھی اور پہاڑی کے مورچوں کی توپیں اور دستی توپ خانے داغ رہے تھے علیٰ ہذا القیاس پوربیوں کی طرف سے لاہوری دروازہ کے برج کی توپیں گھوڑ چڑھی اور بیل براری توپ خانے سب چل رہے تھے۔ گولہ، گراب اور باڑوں کا دونوں طرف سے مینہ برس رہا تھا۔ اس دن شہر کی زمین اور مکانات اور سب دیوار و در لرز رہے تھے۔ بندوقوں کی باڑیں متصل جاری تھیں۔ لڑائی کیا قیامت کے آثار نمودار تھے اور مصداق اذا زلزلت الارض زلزالھا کا آشکار تھا۔ خدا جانے طرفین سے

Scanned by CamScanner

تین سو توپ چل رہی تھی یا چار سو توپ کی باڑھ جھڑ رہی تھی۔ اس کا علم خدا کو ہے غرض کہ یہ کیفیت صبح کے پانچ بجے سے شروع ہوئی تھی اور دس بجے تک یہ قیامت برپا رہی۔''

شہر کی فصیل کو پار کر کے انگریزوں کی فوج کے دستے بازار جامع مسجد کی سیڑھیوں تک جا پہنچے تھے۔ ان دستوں کا مقابلہ شہر کے لوگوں نے کیا۔

''ایک برن انگریزی فوج کا مسجد کی سیڑھیوں تک آ پہنچا تھا اور کچھ لوگ فوج کے رعایا کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار کرنے لگے ادھر فوجیوں نے یہ چاہا کہ جامع مسجد میں داخل ہو جائیں۔ مسجد میں جو مسلمان مسافر جمع تھے انہوں نے دیکھا کہ اب یہ خدا کے گھر میں آ کر کشت و خون کریں گے۔ آؤ بہتر تو یہ ہے کہ مسجد سے نیچے اتر کر ان سے سمجھ لیں۔ یہ کہہ وہ مسجد کے دروازے سے باہر نکل کر سیڑھیوں پر سے اترنے لگے۔ فوج والوں نے ان پر بندوقیں سر کیں مگر جو زندہ رہے وہ سامنے چلے اور باہم جنگ مغلوبہ دست بدست ہونے لگی۔ ایک غل شور برپا اور بلوہ ہو گیا۔ لوگ گھروں میں سے لکڑیاں، پلنگ کی پٹیاں، تلواریں لے کر دوڑ پڑے۔ اس برن میں سے کچھ مارے گئے جنکی لاشیں موجود ہیں اور باقی بھاگ کر اپنے لشکر کو چلے گئے۔ میں یہ تماشا دیکھتا ہوا بڑے دریبے میں ہو کر خونی دروازہ سے نکل کر کوتوالی کے آگے پہنچا۔ میں نے جامع مسجد سے لگا کر کوتوالی تک لاشیں برابر پڑی دیکھیں۔'' (۹۱)

انقلابی فوجیوں نے انتہائی دلیری کے ساتھ تمام معرکوں میں مقابلہ جاری رکھا تھا۔ ں لیے ایک مرحلہ پر انگریزی فوج کا کمان دار ولسن (Wilson) حملہ ختم کر کے کیمپ میں واپسی نصوبہ بنا رہا تھا مگر اس مرحلہ پر نکلسن (Nicholson) نے (جو اس جنگ میں شدید زخمی

Scanned by CamScanner

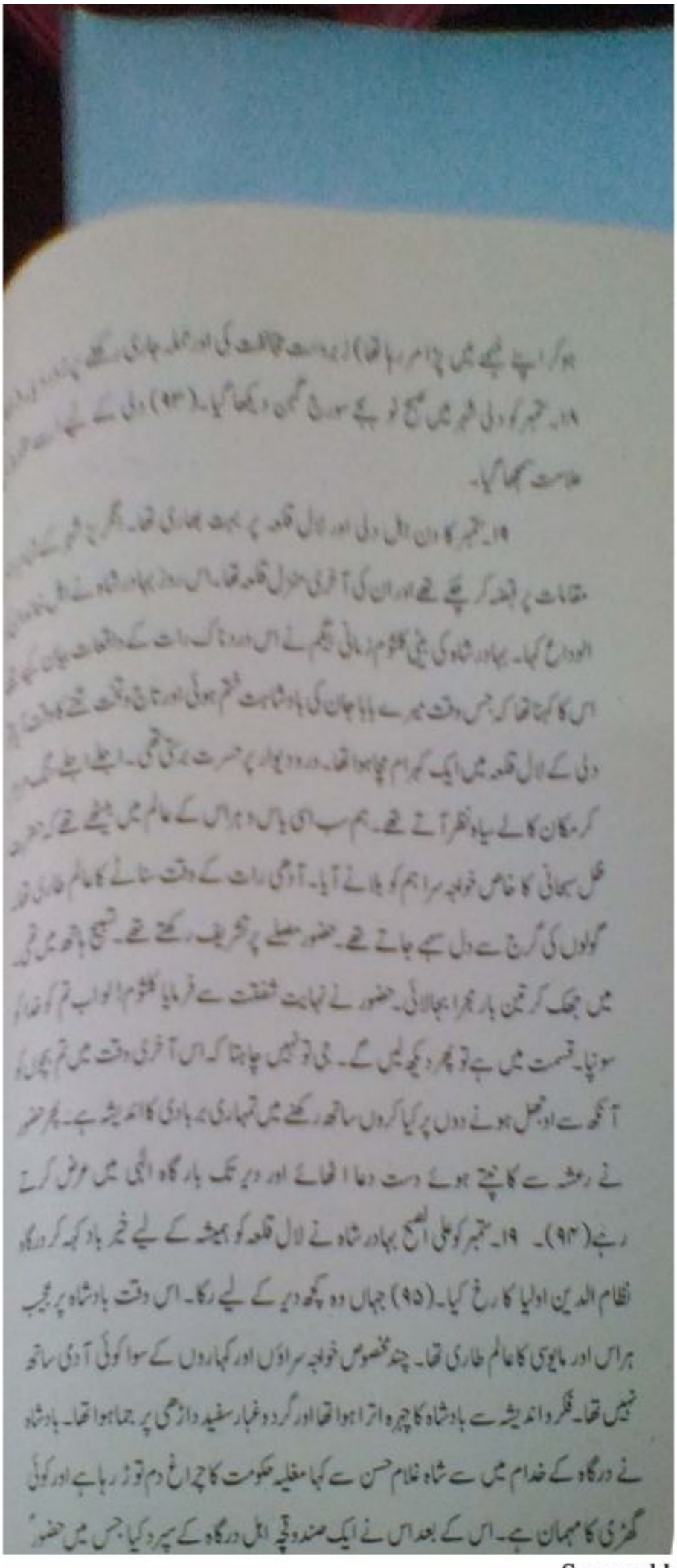

ہو کر اپنے بچے میں پڑا مر رہا تھا) (روایت قالت کی اور عمل جاری رکھنے

۱۹۔ ستمبر کو دلی شہر میں صبح نو بجے سورج گہن دیکھا گیا۔ (۹۳) دلی کے لیے

علامت سمجھا گیا۔

۱۹۔ ستمبر کا دن اہل دلی اور لال قلعہ پر بہت بھاری تھا۔ انگریز شہر کے

مقامات پر قبضہ کر چکے تھے اور ان کی آخری منزل قلعہ تھا۔ اس روز بہادر شاہ نے اہل

الوداع کہا۔ بہادر شاہ کی بیٹی کلثوم زمانی بیگم نے اس دردناک رات کے واقعات بیان

اس کا کہنا تھا کہ جس وقت میرے بابا جان کی بادشاہت ختم ہوئی اور تاج و تخت چھوٹنے

دلی کے لال قلعہ میں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ در و دیوار پر حسرت برس رہی تھی۔ اجلے اجلے

کر مکان کالے سیاہ نظر آتے تھے۔ ہم سب اسی یاس و ہراس کے عالم میں بیٹھے تھے کہ

ظل سبحانی کا خاص خواجہ سرا ہم کو بلانے آیا۔ آدھی رات کے وقت سناٹے کا عالم طاری

گولوں کی گرج سے دل بہے جاتے تھے۔ حضور مصلے پر تشریف رکھتے تھے۔ تسبیح ہاتھ میں تھی

میں جھک کر تین بار مجرا بجالائی۔ حضور نے نہایت شفقت سے فرمایا کلثوم! لو اب تم کو خدا کو

سونپا۔ قسمت میں ہے تو پھر دیکھ لیں گے۔ جی تو نہیں چاہتا کہ اس آخری وقت میں تم بچوں کو

آنکھ سے اوجھل ہونے دوں پر کیا کروں ساتھ رکھنے میں تمہاری بربادی کا اندیشہ ہے۔ پھر حضور

نے رعشہ سے کانپتے ہوئے دست دعا اٹھائے اور دیر تک بارگاہ الٰہی میں عرض کرتے

رہے (۹۴)۔ ۱۹۔ ستمبر کو علی الصبح بہادر شاہ نے لال قلعہ کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر درگاہ

نظام الدین اولیا کا رخ کیا۔ (۹۵) جہاں وہ کچھ دیر کے لیے رکا۔ اس وقت بادشاہ پر عجب

ہراس اور مایوسی کا عالم طاری تھا۔ چند مخصوص خواجہ سراؤں اور کہاروں کے سوا کوئی آدمی ساتھ

نہیں تھا۔ فکر و اندیشہ سے بادشاہ کا چہرہ اترا ہوا تھا اور گرد و غبار سفید داڑھی پر جما ہوا تھا۔ بادشاہ

نے درگاہ کے خدام میں سے شاہ غلام حسن سے کہا مغلیہ حکومت کا چراغ دم توڑ رہا ہے اور کوئی

گھڑی کا مہمان ہے۔ اس کے بعد اس نے ایک صندوقچی اہل درگاہ کے سپرد کی۔ جس میں حضور

Scanned by CamScanner

[illegible]

[illegible] (۹۶)

شہر پر قبضہ مکمل کرنے کے بعد ۱۹ ستمبر کی رات کو لال قلعہ کے سامنے توپیں لگا دی گئی تھیں۔ اگلے روز دہلی بنک کے ورانڈے سے انگریزی فوج توپوں کی گولہ باری کے سائے میں قلعہ کے دروازوں تک بارود بچھانے کے لیے بڑھی مگر یہاں انہیں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ دیر بعد قلعہ کا آدھا دروازہ دھماکے سے گر پڑا۔ اس کے بعد فوج کا ایک کپتان فریڈ میسی (Fred Maisey) اپنے آدمیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ بادشاہ سلیم گڑھ میں ہے اس لیے یہ پارٹی پر جوش انداز میں یہ سوچ کر آگے بڑھے کہ وہ بادشاہ کو گرفتار کر سکیں گے۔ مگر وہاں بادشاہ نہ تھا۔ یہ لوگ پھر لال پردے کے راستے سے آگے بڑھے۔ وہ شاہی خاندان کے افراد کو تلاش کرتے رہے ان کا خیال تھا کہ وہ لوگ اب بھی قلعہ کے اندر تھے۔ (۹۷)

دیوان خاص کے فرش پر برطانوی سپاہیوں کے بوٹوں کا شور تھا۔ اب صورت یہ تھی کہ یہاں کی ہر شے لوٹی جا رہی تھی۔ وحشی سپاہی لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہو گئے تھے۔ بندوق کی گولیاں تالے توڑ رہی تھیں۔ ایک گروہ عجیب قسم کے صندوقچے کھول کر جواہرات تلاش کر رہا تھا۔ دوسرا گروہ مصوری کے نمونے، کتابیں، بندوقیں، پستولیں لوٹ رہا تھا۔ کچھ لوگ مٹھائیاں اور شربت اڑا رہے تھے۔ (۹۸)

۲۰۔ ستمبر کی رات کو برطانوی سپاہیوں نے جامع مسجد میں رقص کیا اور سکھوں نے فتح کی خوشی میں گولیاں چلائیں۔ جنرل ولسن اور اس کے ہیڈ کوارٹر کا سٹاف لال قلعہ کے دیوان خاص میں منتقل ہو گیا جہاں فتح کی خوشی میں اس رات انڈوں اور سؤر کے گوشت کا کھانا

Scanned by CamScanner

شاہ جہاں کی بنائی ہوئی پر شکوہ عمارت میں کھولا گیا اور قلعہ کو ...
شاہ جہاں کے دیوان خاص میں انگریز افسر اور سپاہی دادِ عیش دیتے ...
رہے تھے۔ (۱۰۰)

سنگ مرمر کے در و دیوار، رات بھر برطانوی افسروں کے قہقہوں ...
رہے اور وہ دیوانگی کے عالم میں شراب کے نشے میں چور ہو کر ناچتے رہے۔ یہ وہ ...
طویل زمانہ تک ہندوستان کی قسمت کے فیصلے ہوتے رہے تھے۔ جہاں تک رسائی ...
کے لیے بہت سے شاہی آداب بجا لانے پڑتے تھے اور یہ مقام مغلوں کی عظمت ...
کی علامت تھا۔ ۲۰ ستمبر کی رات کو برطانوی سپاہ کے پاؤں اس مقام کو روند رہے تھے

۲۱ ستمبر کو ولسن کے لیے سب سے اہم مسئلہ اس ٹھکانے کی نشان دہی کا تھا جہاں
کا آخری بادشاہ پناہ گزین تھا۔ برطانوی سپہ سالار (ولسن) نے یہ کام محکمہ سراغ رسانی کے
افسر کیپٹن ہوڈسن (Hodson) کے سپرد کیا تھا۔ جو نہایت خود سر اور از بس سنگ دل انسان ...
ہوڈسن (Hodson) نے بہادر شاہ کی تلاش کا فریضہ منشی رجب علی کو تفویض کیا تھا جو ...
سراغ رسانوں کا افسر اعلیٰ تھا۔ اس کام میں مرزا الٰہی بخش کی مدد بھی حاصل تھی۔ رجب علی ...
سراغ رسانوں نے یہ خبر مہیا کی تھی کہ بادشاہ منتخب اہل خاندان کے ساتھ مقبرہ ہمایوں میں ...
گزین ہے۔ یہ اطلاع ہوڈسن (Hodson) کے ذریعے ولسن (Wilson) تک پہنچ چکی تھی ...
ولسن (Wilson) نے بادشاہ کو گرفتار کرنے کا کام ہوڈسن (Hodson) ہی کے سپرد کیا تھا او...
اسے بادشاہ اور خاندان کی جان بخشی کی اجازت بھی دے دی گئی تھی۔ (۱۰۱)۔ ۲۰ ستمبر کو سقوطِ
دلی کے بعد جنرل بخت خان اور دیگر سرداروں نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ
درخواست کی کہ تھی کہ وہ لشکر کے ساتھ اودھ اور روہیل کھنڈ چلے جہاں جنگ کو جاری رکھا جائے
گا اور ہندوستان بادشاہ کے نام پر جنگ کرے گا۔ اس تجویز کے خلاف مرزا الٰہی بخش نے بات
...۔ بادشاہ کو اس کے بڑھاپے اور زوال کا احساس دلا کر بد دل کیا۔ نتیجتاً اس نے بخت خان کا

لیا گیا۔ یہ فیصلہ ان کے جاں نثاروں اور عقیدت مندوں کے مشورہ
کے خلاف کیا گیا۔ اس لیے کہ ایسے سب لوگ اپنی چیخ و پکار سے
اپنے غصے کا اظہار کر رہے تھے اور شاہ زادوں سے دو انگریز افسروں اور
سکھوں کے خلاف (جن سے ان کی جانی اور مذہبی دشمنی مسلم تھی)
اعلان جنگ کی التماس کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد تینوں شاہ زادے چاروں طرف سے بند رتھ میں (جو
عام طور پر ہندوستانی عورتوں کے سفر کے لیے استعمال ہوتی ہے) بیٹھ کر
باہر آئے۔ شاہ زادوں کے چہروں سے کوئی فکر یا اندیشہ ظاہر نہیں ہوتا
تھا۔ انہوں نے ہوڈسن کو سلام کر کے کہا انہیں یقین ہے کہ ان کا فیصلہ
ایک باقاعدہ عدالت کے ذریعے ہوگا (اس کا مطلب ہے کہ ان سے
یہی طے ہوا ہوگا) ہوڈسن نے ان کے سلام کا جواب دیا اور گاڑی بان کو
دہلی چلنے کی ہدایت کی۔ لوگ شاہ زادوں کے ساتھ ساتھ چلنے پر مصر تھے
مگر ان کو منع کر دیا گیا اور ان کو ہتھیار چھوڑنے کی ترغیب دی گئی۔ اس
میں کافی وقت صرف ہوا۔ جب یہ سب طے ہو گیا تو ہوڈسن رتھ کے
پیچھے چلا اور دہلی سے ایک میل دور اور ہمایوں کے مقبرے سے پانچ میل
دور ایک مقام پر ان سے جا ملا۔ گاڑی کے گرد ایک ہجوم جمع تھا اور ڈر تھا
کہ یہ لوگ حفاظتی دستے پر حملہ نہ کر دیں۔ ہوڈسن نے اپنے گھوڑے کو
درمیان میں لاتے ہوئے کہا:

"اس کی قید میں جو لوگ ہیں قصابوں سے کم نہیں۔ انہوں نے قتل و خون
کے علاوہ عورتوں اور بچوں پر بے حد مظالم کیے ہیں۔"

ں پر اسلحے سے لدے سکھ سپاہی جو ہوڈسن کے ساتھ تھے جوش و خروش

Scanned by CamScanner

> سے ہوڈسن کی حفاظت میں شہر سے نکلنے لگے۔ یہ دیکھ کر لوگوں کا ہجوم پیچھے ہٹنے لگا۔ ہوڈسن نے رتھ کو سپاہیوں کے گھیرے میں لے لیا اور شاہ زادوں کو باہر آنے کا حکم دیا۔ ان کے باہر آتے ہی ان سے ہتھیار چھین لیے گئے اور انہیں کپڑے اتارنے پر مجبور کیا اور انہیں دوبارہ رتھ میں بیٹھنے کو کہا۔ ان کے رتھ میں بیٹھتے ہی ہوڈسن نے بذات خود ان کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا۔ شاہ زادوں کا اسلحہ، کپڑے اور زیورات سمیٹنے کے بعد ہوڈسن شہر پہنچا اور شاہ زادوں کی لاشوں کو شہر کے تھانے کے سامنے ڈال دیا۔ (یہ لاشیں اس وقت تک وہاں پڑی رہیں جب تک حفظان صحت کا خطرہ لاحق نہ ہو گیا) یہ وہی جگہ تھی جہاں دو سو سال قبل اورنگ زیب نے سکھوں کے گرو تیغ بہادر کے سر کو رکھا تھا۔ اس حسن اتفاق پر سکھ بہت مسرور ہوئے۔ ہوڈسن بھی خاندان تیموریہ کے آخری چراغ بجھا کے بے حد مسرور تھا۔" (۱۰۳)

سقوط دلی کے بعد لوٹ مار اور قتل و غارت کے سبب شہر کا منظر بے حد خوف ناک ہو چکا تھا۔ ان ایام میں ایک برطانوی افسر رابرٹس (Roberts) نے شہر کی دردناک حالت کا منظر پیش کرتے ہوئے یہ بتایا ہے:

> "لال قلعے کے لاہوری دروازے سے نکل کر ہم چاندنی چوک میں سے گزرے۔ دہلی حقیقتاً شہر خموشاں معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے اپنے گھوڑوں کے سموں کی آواز کے سوا کوئی آواز کسی سمت سے نہ آتی تھی۔ ایک بھی زندہ مخلوق ہماری نظر سے نہ گزری۔ ہر طرف نعشیں بکھری پڑی تھیں۔ ہر نعش وہ حالت طاری تھی جو موت کی کشمکش نے طاری کر دی تھی۔ ہر نعش تجزیہ و ل کے مختلف مراحل میں تھی۔ ہم چپ چاپ چلے جا رہے تھے یا مجھ

Scanned by CamScanner

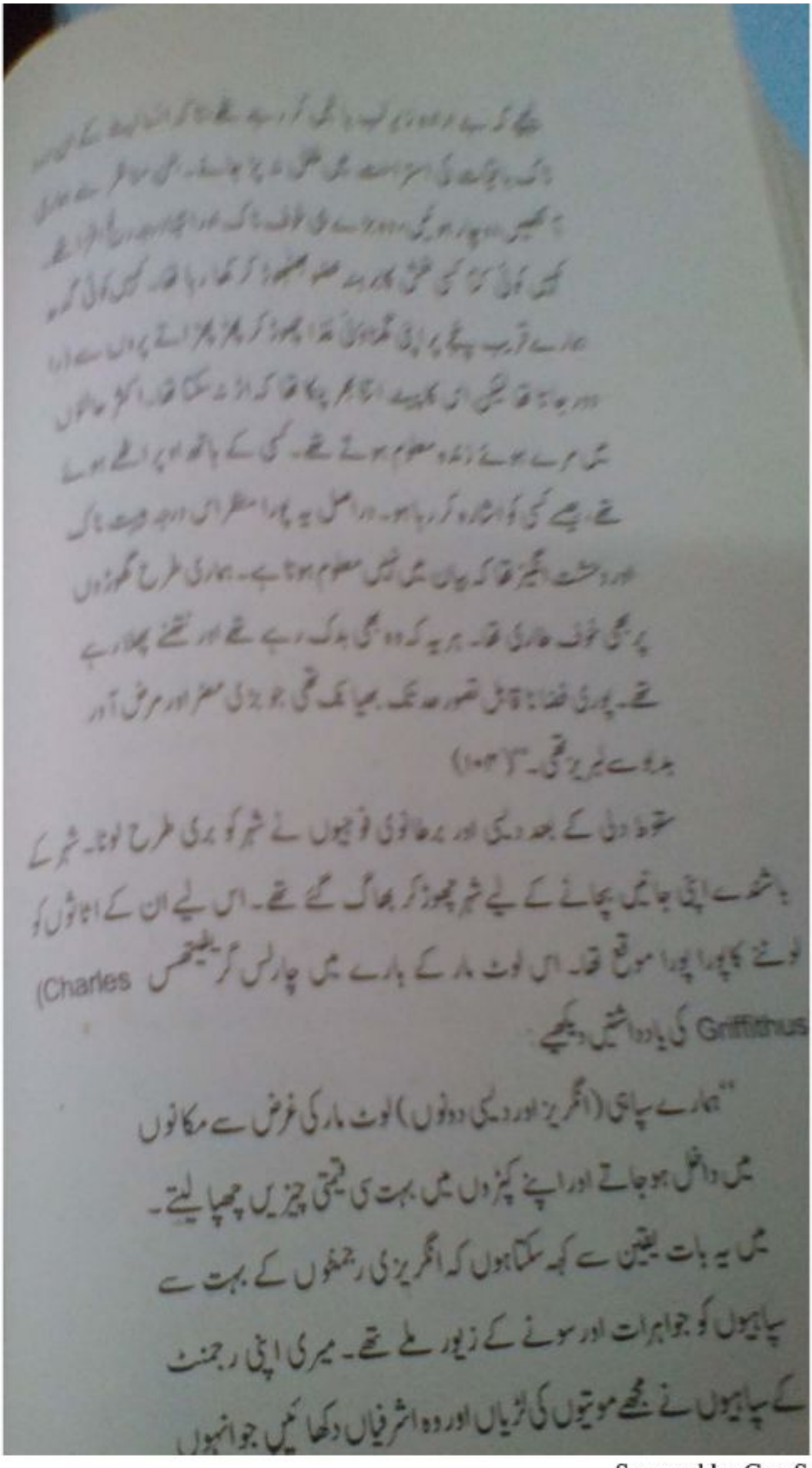

> [illegible]
>
> میں مرے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے۔ کسی کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے، جیسے کسی کو اشارہ کر رہا ہو۔ دراصل یہ پورا منظر اس قدر ہیبت ناک اور دہشت انگیز تھا کہ بیان میں نہیں ... معلوم ہوتا ہے۔ ہماری طرح گھوڑوں پر بھی خوف طاری تھا۔ ہر چیز کہ وہ بھی بدک رہے تھے اور نتھنے پھلا رہے تھے۔ پوری فضا ناقابل تصور حد تک بھیانک تھی جو بڑی سڑی اور مرض آور بدبو سے لبریز تھی۔ (۱۰۳)

سقوط دلی کے بعد دیسی اور برطانوی فوجیوں نے شہر کو بری طرح لوٹا۔ شہر کے باشندے اپنی جانیں بچانے کے لیے شہر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اس لیے ان کے اثاثوں کو لوٹنے کا پورا پورا موقع تھا۔ اس لوٹ مار کے بارے میں چارلس گریفتھس (Charles Griffithus) کی یادداشتیں دیکھیے:

> "ہمارے سپاہی (انگریز اور دیسی دونوں) لوٹ مار کی غرض سے مکانوں میں داخل ہو جاتے اور اپنے کپڑوں میں بہت سی قیمتی چیزیں چھپا لیتے۔ میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انگریزی رجمنٹوں کے بہت سے سپاہیوں کو جواہرات اور سونے کے زیور ملے تھے۔ میری اپنی رجمنٹ کے سپاہیوں نے مجھے موتیوں کی لڑیاں اور وہ اشرفیاں دکھائیں جو انہوں

Scanned by CamScanner

نے لوٹ میں حاصل کی تھیں۔ افسروں اور سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد نے بڑی بڑی رقمیں دے کر فوج سے علیحدگی حاصل کر لی تھی۔"

"شروع شروع میں کئی ایک سپاہی لوٹ مار سے باز رہے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ان سے کہیں بلند درجہ کے افسر لوٹ مار میں شریک ہیں تو ان کی دیانت بھی ختم ہو گئی۔ ہر شخص میں یہ خواہش پیدا ہو چکی تھی کہ وہ لوٹ کھسوٹ کے مال سے اپنے آپ کو دولت مند بنا لے۔ جب میں اپنے دوستوں کے ساتھ لوٹ مار کے ارادوں سے شہر میں جاتا تو میں دوسرے افسروں کو بھی لوٹ کی تلاش میں پاتا۔ یہ اتفاقی ملاقاتیں بہت دلچسپ ہوتی تھیں۔ دونوں طرف سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ ان کا مقصد لوٹ مار نہیں بلکہ محض سیر و تفریح تھا۔

"ایک دن ایک چھوٹے سے مندر میں داخل ہوئے۔ یہ مندر چاندنی چوک سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ مندر کی عمارت کے درمیان ایک بہت بڑا بت تھا جسے ہمارے ہتھوڑوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ بت نے جواہرات، ہیرے، لعل، زبرجد اور اشرافیاں اگل دیں۔ ہم نے بہت سی قیمتی چیزیں اپنے پاس رکھ لیں اور کچھ سامان پرائز ایجنسی میں بھیج دیا۔

"ان واقعات کو کئی سال گزر چکے ہیں۔ لیکن ان تین ہفتوں کی لوٹ مار کی یاد اب تک میرے ذہن میں باقی ہے۔ میری زندگی کے یہ واقعات پریوں کے قصوں یا الف لیلہ کی کہانیوں سے زیادہ ملتے جلتے ہیں۔"

"انگلستان کے جس شہر میں ہم رہتے تھے وہاں کے جوہریوں کی دکانیں مشرقی وضع کے زیوروں سے بھری پڑی تھیں۔ جوہریوں نے یہ سارا سامان ہمارے سپاہیوں سے خریدا تھا۔" (۱۰۵)

Scanned by CamScanner

"Each street was filled with a mass of debris, all lying in inextricable confusion... We entered several of the large houses belonging to the wealthier class of natives and found every one in the same condition, turned inside out, their ornaments torn to pieces, costly articles, too heavy to remove, hattered into fragments ... We saw parties of Europeans and native soldiers, all eager in pursiut of plunder, going from house to house, or diving down courts and alleys when they saw us approaching. Interference or remonstrance with these men would have been useless, if not dagerous; in their excited state they were no respecters of persons, and we deemed it the better judgement to take no notice of their actions ... To my certain knowledge many soldiers of the English regiments got possession of jewellery and gold ornaments taken from the

Scanned by CamScanner

bodies of the slain city inhabitants, and I was shown by men of my regiment strings of pearls and gold *mohurs* which had fallen into their hands ... That many of the private soldiers of my regiment succeeded in acquiring a great quantity of valuable plunder was fully demonstrated soon after our return to England.

Although much, perhaps most, of the treasure unearthed was appropriated by those who discovered it, an enormous quantity was handed over to the prize agents who seem to have added to their collections by the most ruthless methods."(۱۰۴)

کرنل بوشیر (Colonel Bourchier) نے دلی پر قبضے کے بعد لال قلعہ کی دیواروں سے شہر کو دیکھتے ہوئے اپنی ڈائری میں یہ لکھا تھا کہ تباہی کے دیوتا نے اس تباہی پر بھرپور جشن منایا ہے۔ کشمیری اور موری دروازے کے قرب و جوار کے مکان کھنڈرات بن گئے تھے۔ انگریز فوج کے تھکے ہارے سپاہی فتح کے بعد شراب کے نشے میں دیوانے ہو گئے تھے۔ شہر میں داخلے کے بعد انہیں جو کوئی انسان نظر آیا وہ مار ڈالا گیا۔ ایسے انسانوں کی تعداد کثیر تھی۔(۱۰۷) شہر میں اس وقت کسی شخص کی جان محفوظ نہ تھی۔ تمام صحیح الجثہ اشخاص جو دکھائی دیے باغی قرار دیے گئے اور انہیں گولی مار دی گئی۔ دیگر لوگ بھی جنہوں نے بغاوت میں کسی قسم کا حصہ نہیں لیا تھا، قتل کیے گئے۔ شہر کے بہت سے نامی لوگ مارے گئے کیوں کہ ان کی نسبت غلطی

Scanned by CamScanner

سے سمجھ لیا گیا تھا کہ وہ باغی ہیں۔

انقلابی سپاہیوں اور عام لوگوں کو بے دردی سے پھانسی پر لٹکایا گیا۔ دلی میں چاندنی چوک کی کوتوالی کے سامنے ایک حوض کے تین طرف پھانسیاں دی جاتی تھیں جہاں ایک طرف تماشائیوں کے لیے کرسیاں بچھی رہتی تھیں۔ تیسرے پہر فوجی بینڈ بجایا جاتا تھا اور مجرموں کی قطاریں پیش ہوتی تھیں۔ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوتے تھے۔ کچھ لوگ دار پر چڑھا دیے جاتے اور باقی موت کے منتظر رہتے تھے۔(۱۰۸) جلادوں سے کہا جاتا کہ مجرموں کو دیر تک لٹکائے رکھیں تا کہ انگریز سپاہی باغیوں کی موت کا رقص دیکھ سکیں۔ انگریز سپاہی سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے پھانسی کے منظروں سے مسرور ہوتے۔(۱۰۹)

''وہ گھٹا جو کالوں کی بغاوت کا لباس پہن کر آسمان جہاں آباد پر نمودار ہوئی تھی۔ اب اس سے خون کی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ مشکل ہی سے کوئی ایسا خاندان ہوگا جس کے گھر اور در ان چھینٹوں سے محفوظ ہوں۔ رات کے وقت جب ماممتا کی ماریوں کے نالے بلند ہوتے تھے تو سننے والوں کا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ اور صبح کے وقت جب گھونگھٹ کی دلہنوں کے خاموش آنسو بیوگی کی فریاد کرتے تو در و دیوار ان کے ساتھ روتے۔ مصائب کے اس طوفان میں گنہگار اور بے گناہ سب بہہ رہے تھے۔ جہاں اطمینان و مسرت کی ریل پیل تھی وہاں کہرام مچے ہوئے تھے، دودھ پیتے بچے بلوں بلوں کرتے اور حسن کی دیویاں دو دو دانوں کو ترستیں۔ مخبروں کا راج اور پھانسیوں کا بازار گرم تھا۔ ہر وقت سٹ ہی سٹ پر جان تھی کہ نہ معلوم کب گرفتار ہوں اور پھانسی لگ جائے۔ پھانسی کے پھندے مٹکاف صاحب کی جیب میں رہتے تھے اور وہ اپنے سامنے درخت میں بندھوا دیتے تھے دو دو مجرم ایک ایک درخت کے

Scanned by CamScanner

پیچھے پشت کی طرف مشکیں باندھ کر بٹھا دیے جاتے تھے اور صاحب کے
حکم سے پھانسی ہو جاتی تھی۔" (۱۱۰)

بہادر شاہ ظفر کو گرفتاری کے بعد ایک نہایت معمولی جگہ پر بند کر دیا گیا تھا۔ جہاں ان کے ساتھ بڑی ذلت کا سلوک کیا جا رہا تھا۔ اسے کینڈل کوگ ہل (Kendal cog hill) کی نگرانی میں دیا گیا تھا۔ کوگ ہل بہادر شاہ کو سور کہنے سے بھی گریز نہ کرتا تھا۔۔۔ مسز رتھ ایم۔ کوپ لینڈ (Ruth M.Coopland) نے بہادر شاہ کو سقوط دلی کے کچھ دیر بعد دیکھا تھا۔ اس نے دلی کے معزول بادشاہ کو جس حالت میں دیکھا تھا اس کا نقشہ وہ یوں بیان کرتی ہے:

"In the afternoon Captain and Mrs Garstone and myself, with another officer and his wife, went to see the King of Delhi. drove down the Corridor into a dirty street ... We then came to a large ruined, broken-up garden, where we were joined by Mr Omanney, a young civilian, who had charge of the king. We climbed some steep steps on to the terrace, where some more guards were walking before the door, and entered a dirty-looking house, then the abode of the 'king of kings', the descendant of a long line of Moguls, including Shah Jehan, Aurangzebe, and Timour. Pushing aside the purdah, we entered a small, dirty, low room with

Scanned by CamScanner

white-washed walls, and there, on a low charpoy, cowered a thin small old man, dressed in a dirty white suit of cotton, and rolled in shabby wraps and rezais, on account of the cold. At our entrance he laid aside the hookah he had been smoking, and he, who had formerly thought it an insult for any one to sit in his presence, began salaaming to us in he most abject manner, and saying he was 'burra kooshee' (very glad) to see us.

As we looked at him we though how strange it was that this frail old man, tottering on the bring of the grave, could harbour such a plot and such deep revengeful feelings against us. His face was pale and wan, and his eyes weak and uncertain, seeming to shun our scrutiny; but an aristocratic expression of face reminded us of his noble descent. He had a venerable-looking white beard, and he swayed about in a frail decrepit way, exciting feelings that were a mixture of

the degraded position to which he had brought himself by his wild scheme of reinstating himself on a throne which he could only hope to enjoy for a passing year or two; abhorrence, that he could give up our poor countrymen to be brutally murdered, and even, it is said, feast his eyes and ears on their dying anguish; and pity, that he should have so short a time for repentance, and that the descendant of a line of kings, whose splendour and power were boundless, should be thus degraded.

We ladies, after gazing at the king and his son, Jumma Bukh, son of Zeenat Mahal, the king's favourite wife, who had a shrewd clever face for a boy about fourteen, were allowed to see the queen, Zeenat Mahal - a favour not granted to the gentlemen. It seemed absurd to humour thus their silly prejudices, when they had spared no European in their power any indignity or insult. However, we raised the 'chick' which separated the queen's room from the king's, and entered a

Scanned by CamScanner

very small bare, shabby room. Seated on a charpoy we beheld a large bold-looking woman, with not the least sign of royalty of dignity about her. She seemed about forty, her complexion was tawny; and her face large and coarsely featured, with daring black eyes and wide mouth, and dark hair partially concealed under her white cotton chudda (veil). She wore a cotton dress of black print and but few ornaments; her small and well-shaped hands and feet were bare. Judging from her looks, she seemed capable of inciting tbe king on the deeds of blood, which she was accused of havng done. She began asking Mrs Garstone and the other lady about their husbands, and why Mrs Garstone had not brough her children, as she wished to see them; then, looking at my black dress, she sneeringly asked me what had become of my 'sahib'. I wa so angry at her look and tone of heartless contempt, that I said, 'Chupero' (silence), an walked out of her presence ...

Scanned by CamScanner

I afterwards heard that the king and queen did not live on very good terms. She said that he would still consider himself a king, and when she sent for things from the bazaar, he pronounced them not good enough for him; and that he would not smoke the tobacco when it came, because he did not consider it nice enough. He complained that she had plenty of concealed money and jewels, which she would not sacrifice to his comfort; so that Mr Omanney was obliged to allow him four annas a day, - about six pence.(۱۱۲)

ایک تنگ اور بوسیدہ کمرے کی معمولی سی چارپائی پر لیٹے ہوئے شخص کو دیکھ کر کوئی یہ باور نہ کر سکتا تھا کہ یہ مغلوں کی عظیم سلطنت کا آخری وارث بہادر شاہ ہے۔ انگریز افسر فخر کے ساتھ یہ بات سناتے تھے کہ دلی کے آخری مغل بادشاہ نے انہیں چارپائی سے اٹھ کر سلام کیا۔ سن ستاون کی بغاوت فرو ہونے کے چند مہینے بعد "لندن ٹائمز" کا مشہور صحافی ولیم رسل (William Russel) ہندوستان کے مختلف شہروں سے گزرتا اور لکھنو میں جنگ کے آخری ناظر کی رپورٹیں قلم بند کرتا ہوا دلی آیا تھا۔ وہ دلی کے آخری مغل بادشاہ سے ملنے کے لیے بھی گیا تھا۔ اس نے لال قلعہ کے ایک ویران اور تاریک کمرے میں میلے کچیلے لباس میں ملبوس سر پر معمولی ٹوپی پہنے ایک بیمار شخص کو دیکھا تھا جو پستہ قد تھا اور ضعیف تھا اور ایک برتن پر جھکا مسلسل قے کیے جا رہا تھا۔ اس کی متلی ختم ہوئی تو وہ نقاہت سے ہانپنے لگا۔ رسل نے اس

Scanned by CamScanner

کمرے میں معزول بادشاہ کی چہیتی ملکہ زینت محل کی آوازیں پردے کے پیچھے سے آ رہی تھیں۔ وہ بہادر شاہ کے متعلق بری باتیں کہہ رہی تھیں۔ زینت محل نے کہا کہ یہ بوڑھا اب بھی بادشاہ کی طرح بیٹھا ہے۔ میں اس سے قطع تعلق کر کے اسے چھوڑ جانا چاہتی ہوں۔ میں بہت تنگ ہوں۔ جب رسل بہادر شاہ کی اقامت گاہ سے باہر نکل رہا تھا تو زینت محل غصے سے بولتی جا رہی تھی اور بہادر شاہ کی آواز سنائی دے رہی تھی کہ اے خدا اس عورت سے میری فریاد سن (۱۱۳)۔

زینت محل کی فریاد نہ سنی گئی۔ جنوری ۱۸۵۸ء میں بہادر شاہ پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ وہ ہانپتا کانپتا بے دلی کے عالم میں مقدمے کی سماعت میں موجود رہا۔ شاہجہان کے بنائے ہوئے دیوان خاص میں یہ مقدمہ چلتا رہا تھا۔ مقدمے کی سماعت کے دوران اکثر اوقات وہ گم سم بیٹھا رہتا تھا۔ کبھی کبھی اس پر غشی طاری ہو جاتی تھی۔ یہ بات یقینی ہے کہ اسے اپنے انجام کا علم تھا۔ ۹۔ مارچ ۱۸۵۸ء کو عدالت نے یہ فیصلہ سنایا:

> ''عدالت اس شہادت پر جو اس کے پیش نظر ہے متفق ہے کہ ملزم محمد بہادر شاہ سابق بادشاہ دہلی تمام جرائم کے مجرم ہیں۔ جو ان کے خلاف بیان کیے گئے ہیں۔''

۹۔ اپریل کو میجر جنرل این پینی نے عدالت کے فیصلے کو منظور کرتے ہوئے سزا کی تصدیق کر دی۔ بہادر شاہ کو جلاوطن کر کے رنگون بھیجنے کی سزا دی گئی۔ ۷۔ اکتوبر ۱۸۵۸ء کو تین پالکی نما گاڑیوں کے قافلے کی صورت میں اسے دلی سے رنگون جانے کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ دلی کی کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جس سے آنسوؤں کی لڑیاں نہ بہہ رہی ہوں۔ بادشاہ نے اپنی سواری کے پردے اٹھا دیے۔ اس کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف تھے اور وہ اہل وطن کو خدا کے سپرد کر رہا تھا۔ اس کے بعد کا زمانہ جلاوطنی کی حالت میں رنگون میں گزرا جہاں چار سال کی اذیت ناک زندگی کا خاتمہ نومبر ۱۸۶۲ء میں ہوا۔ یہ ۷۔ نومبر ۱۸۶۲ء میں رنگون شہر کی ایک صبح تھی۔ اس روز

Scanned by CamScanner

پت جھڑ کے پتے اڑتے پھر رہے تھے۔ صبح کے پانچ بجے تھے۔ اس صبح کو ہندوستان کا جلاوطن معزول بادشاہ جسم و جاں کی قید سے آزاد ہوا۔ اس کی تدفین کا بندوبست نگران برطانوی افسر کی موجودگی میں ہوا۔ تجہیز و تدفین کے لیے ایک ملا کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ اس کے جسم کو ساگوان کے ایک صندوق میں رکھ کر سرخ رنگ کے سوتی کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ ۷۔ نومبر ہی کو شام چار بجے اسے اینٹوں کی ایک قبر میں دفن کر دیا گیا اور قبر کے اوپر مٹی ڈال کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔

حوالہ جات

۱۔ ناصر نذیر فراق دہلوی، لال قلعے کی ایک جھلک انتظار مرزا: مرتب (دلی: اردو اکادمی، ۱۹۸۷ء) ص ۶۸

۲۔ منشی فیض الدین، بزم آخر، کامل قریشی مرتب: (دلی: اردو اکادمی ۱۹۹۲ء) ۴۵

۳۔ بزم آخر، ص ۷۷

۴۔ بزم آخر، ص ۷۶

۵۔ مذکورہ حوالہ ۷۸

۶۔ بزم آخر، ص ۷۵

۷۔ ظہیر دہلوی، داستان غدر (لاہور: اکادمی پنجاب، ۱۹۵۵ء) ۶۸۔۶۷

۸۔

۹۔ لال قلعے کی ایک جھلک، ص ۶۹۔۶۸

۱۰۔ داستان غدر، ص ۷۱۔۸۹

۱۱۔ عتیق صدیقی، اٹھارہ سو ستاون۔ اخبارات و دستاویزات (دلی: مکتبہ شاہراہ) ۴۰۔۳۹

Scanned by CamScanner

۱۲۔ لال قلعے کی ایک جھلک، ص ۵۰

۱۳۔ داستان غدر، ص ۷۹

۱۴۔ مذکورہ حوالہ، ص ۸۰

۱۵۔ داستانِ غدر، ۷۹

۱۶۔ A narrative of Syed Mubarik Shah, reffered by Micheal Edwards in Red year (London:Hamish Hamilton, 1973) p.185

۱۷۔ داستانِ غدر، ۸۱

۱۸۔ Norman & Mrs.Kieth Young, Delhi 1857(Delhi: Gain Publishing House,1988)p.22

۱۹۔ John William Kaye, A History of the Great Revolt(Delhi: Gain Publishing House,1988)p79-80

۲۰۔ Ibid p.80

۲۱۔ اٹھارہ سو ستاون، اخبارات و دستاویزات، ص ۴۱

۲۲۔ Great Revolt, V.II, p.81

۲۳۔ ibid, p.81-82

۲۴۔ اٹھارہ سو ستاون اخبارات و دستاویزات، ص ۴۲

۲۵۔ مذکورہ حوالہ، ص ۴۰۱

۲۶۔ Delhi 1857, p.324

۲۷۔ Christopher Hawees, Poor Relations (Richmond: Curzon Press, 1996) 99-1-1

۲۸۔ اٹھارہ سو ستاون اخبارات و دستاویزات، ص ۴۵

Scanned by CamScanner

۳۰۔ اٹھارہ سو ستاون اخبارات و دستاویزات، ص ۳۴

۳۱۔ معین الدین حسن خاں، خدنگ غدر، (دلی: شعبہ اردو دلی یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء)، ص ۹۲

۳۲۔ P.J.O. Taylor, A Companion to the Indian Mutiny of 1857. (Delhi: Oxford University Press, 1996).p.102

۳۳۔ داستان غدر، ص ۱۱۶_۱۱۷

۳۴۔ اٹھارہ سو ستاون اخبارات و دستاویزات، ص ۳۵

۳۵۔ مذکورہ حوالہ ۴۳

۳۶۔ Great Revolt. V.II,p.100

۳۷۔ اٹھارہ سو ستاون اخبارات و دستاویزات، ص ۲۸۰

۳۸۔ مذکورہ حوالہ ص ۳۰۶

۳۹۔ مذکورہ حوالہ ص ۳۱۸

۴۰۔ مذکورہ حوالہ ص ۱۳۵

۴۱۔ اٹھارہ سو ستاون اخبارات و دستاویزات، ص ۴۷

۴۲۔ مذکورہ حوالہ ص ۵۳

۴۳۔ مذکورہ حوالہ ص ۶۱

۴۴۔ معین الدین حسن، جیون لال، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دو خفیہ روزنامچے (لاہور: تخلیقات، ۱۹۹۹ء) ۱۴۲_۱۴۳

۴۵۔ مذکورہ حوالہ ص ۱۶۴

۴۶۔ مذکورہ حوالہ ص ۱۶۶

۴۷۔ مذکورہ حوالہ ص ۱۴۶

Scanned by CamScanner

۴۸۔ مذکورہ حوالہ ص ۱۴۸

۴۹۔ اٹھارہ سو ستاون اخبارات و دستاویزات، ص ۲۹۳

۵۰۔ دو خفیہ روزنامچے، ص ۱۲۵

۵۱۔ Delhi in 1857, p39,57

۵۲۔ ibid, 153

۵۳۔ P.J.D.Tylor, What Really Happened During the Mutiny
(Delhi:Oxford University Press, 1999) p.54

۵۴۔ ibid 56

۵۵۔ ibid 56

۵۶۔ The Punjab and Delhi in 1857, p.286

۵۷۔ ibid 290

۵۸۔ ibid 295

۵۹۔ داستان غدر، ص ۱۲۹۔۱۲۸

۶۰۔ Delhi and Punjab in 1857, p.297

۶۱۔ Christopher Hibbert, The Great Mutiny
(England:Penguin,1980)p.280

۶۲۔ ibid 281

۶۳۔ ibid 283

۶۴۔ ibid 283

۶۵۔ ibid 287-288

Scanned by CamScanner

۶۶۔ The Punjab and Delhi in 1857, p.298

۶۷۔ ibid p.302

۶۸۔ ibid p.305

۶۹۔ داستان غدر، ص ۱۳۳

۷۰۔ The Great Mutiny .p.290-291

۷۱۔ David Bloomfield, Lahore to Lucknow-Mutiny Journal of Arthur moffott lang (London: Leo Cooper, 1992) p.55

۷۲۔ The Great Mutiny, p.291

۷۳۔ John Harris, The Indian Mutiny (Hertord shire:wordnorth.2001)p.125-126

۷۴۔ سلیم قریشی، غداروں کے خطوط (لاہور: نگارشات، ۱۹۹۹ء) ۱۷۹

۷۵۔ داستان غدر، ۱۳۳

۷۶۔ مذکورہ حوالہ ۲۰۶

۷۷۔ مذکورہ حوالہ ۲۱۷

۷۸۔ اٹھارہ سو ستاون اخبارات و دستاویزات، ۳۳۳

۷۹۔ غداروں کے خطوط، ۲۱۸

۸۰۔ مذکورہ حوالہ ۱۶۴، ۱۷۱

۸۱۔ مذکورہ حوالہ ۲۳۶

۸۲۔ مذکورہ حوالہ ۲۴۹

۸۳۔ مذکورہ حوالہ ۱۹۰

۸۴۔ مذکورہ حوالہ ۲۱۵

Scanned by CamScanner

۸۵۔ مذکورہ حوالہ ۲۲۰۔۲۱۹

۸۶۔ مذکورہ حوالہ ۲۳۷

۸۷۔ مذکورہ حوالہ ۲۳۸

۸۸۔ مذکورہ حوالہ ۲۳۹۔۲۳۳

۸۹۔ The Great Mutiny p.300-301

۹۰۔ Lahore to Lucknow, p.86

۹۱۔ داستان غدر، ص ۹۱

۹۲۔ The Great Mutiny,p.309

۹۳۔ Lahore to Lucknow, p.95-97

۹۴۔ خواجہ حسن نظامی، بیگمات کے آنسو (لاہور: خواجگان پبلی کیشنز، س۔ن) ۱۳۔۱۲

۹۵۔ Mehdi Hasan, Bahadur Shah and the war of 1857(Delhi: Atma Ram, 1958)p.280

۹۶۔ بیگمات کے آنسو، ۱۰۸۔۱۰۷

۹۷۔ William Dalrymple, The Last Mughal (London, Bloomsbury,2006) 376-378

۹۸۔ ibid 383-384

۹۹۔ ibid 384

۱۰۰۔ Lahore to Lucknow 97

۱۰۱۔ The Great Revolt 634

۱۰۲۔ ibid 655

۱۰۳۔ غداروں کے خطوط ۵۲۔۵۰

Scanned by CamScanner

۱۰۴۔ غلام رسول مہر، ۱۸۵۷ء، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۵۷) ۳۰۴

۱۰۵۔ پاری، کمپنی کی حکومت (لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۶۹) ۳۹۸

۱۰۶۔ The Grat Mutiny p.319

۱۰۷۔ Micheal Edwards, Red Year(London:Hamish Hamiton) p.59

۱۰۸۔ کمپنی کی حکومت ۳۹۷

۱۰۹۔ Red year p.60

۱۱۰۔ راشد الخیری، دلی کی آخری بہار، ص ۷۳

۱۱۱۔ The Great Mutiny, p.318

۱۱۲۔ Indra Ghose, Memsahibs Abroad(Delhi: oxford university press, 1998) 213-214

۱۱۳۔ William Howard Russel. My Indian Mutiny Diary(London: Cassell and company, 1957)172-176

Scanned by CamScanner

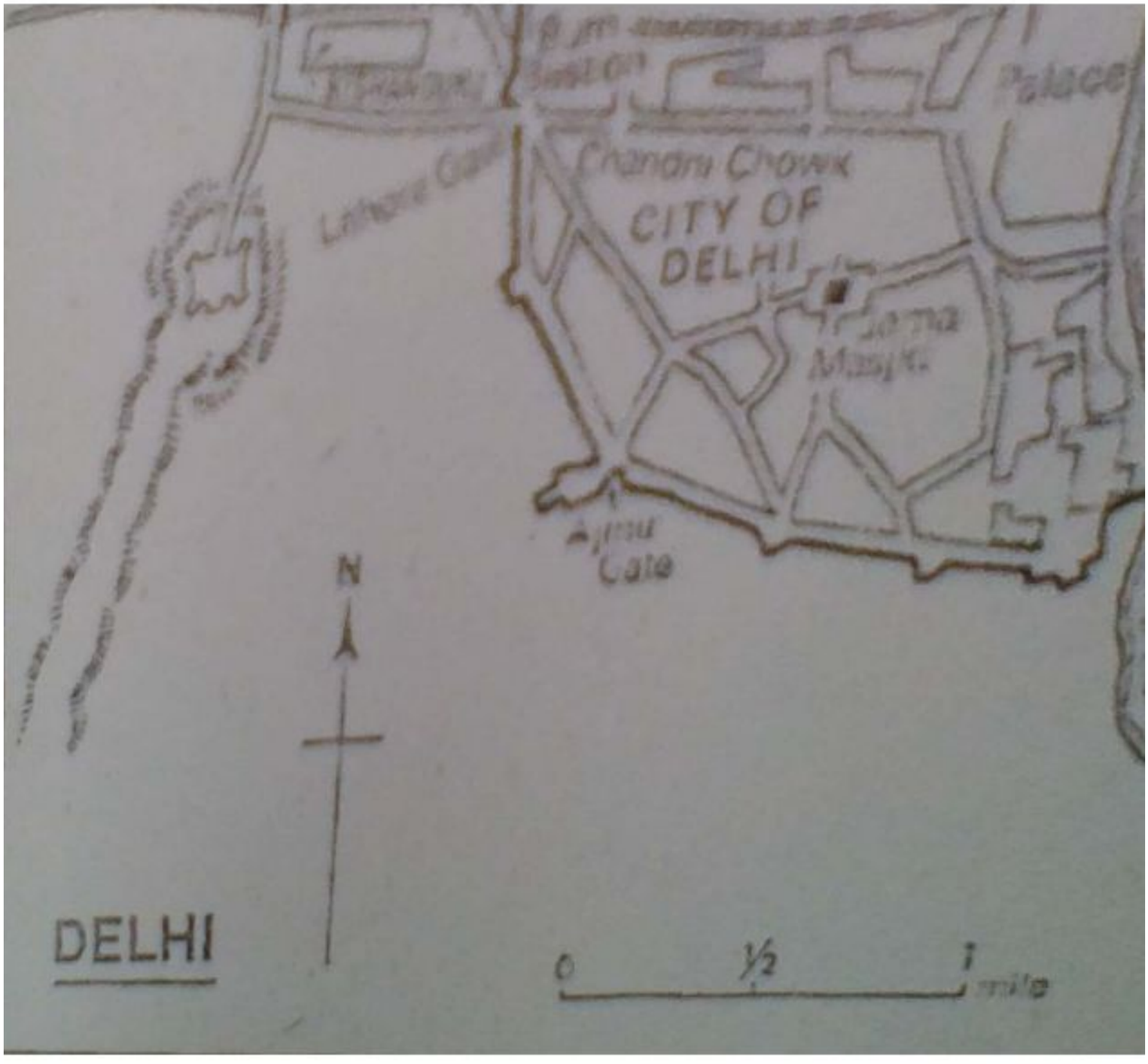

Scanned by CamScanner

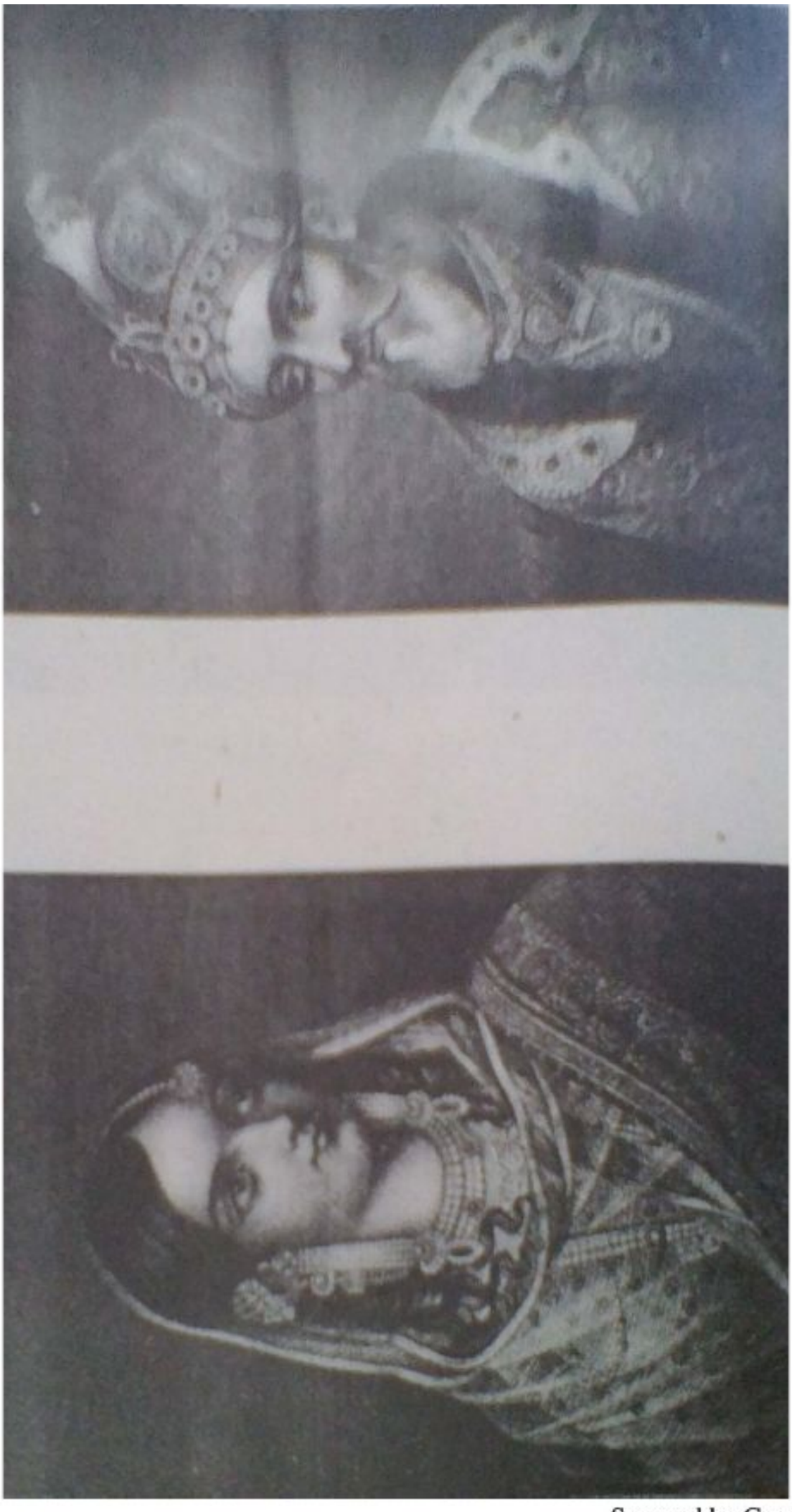

Scanned by CamScanner

Scanned by CamScanner

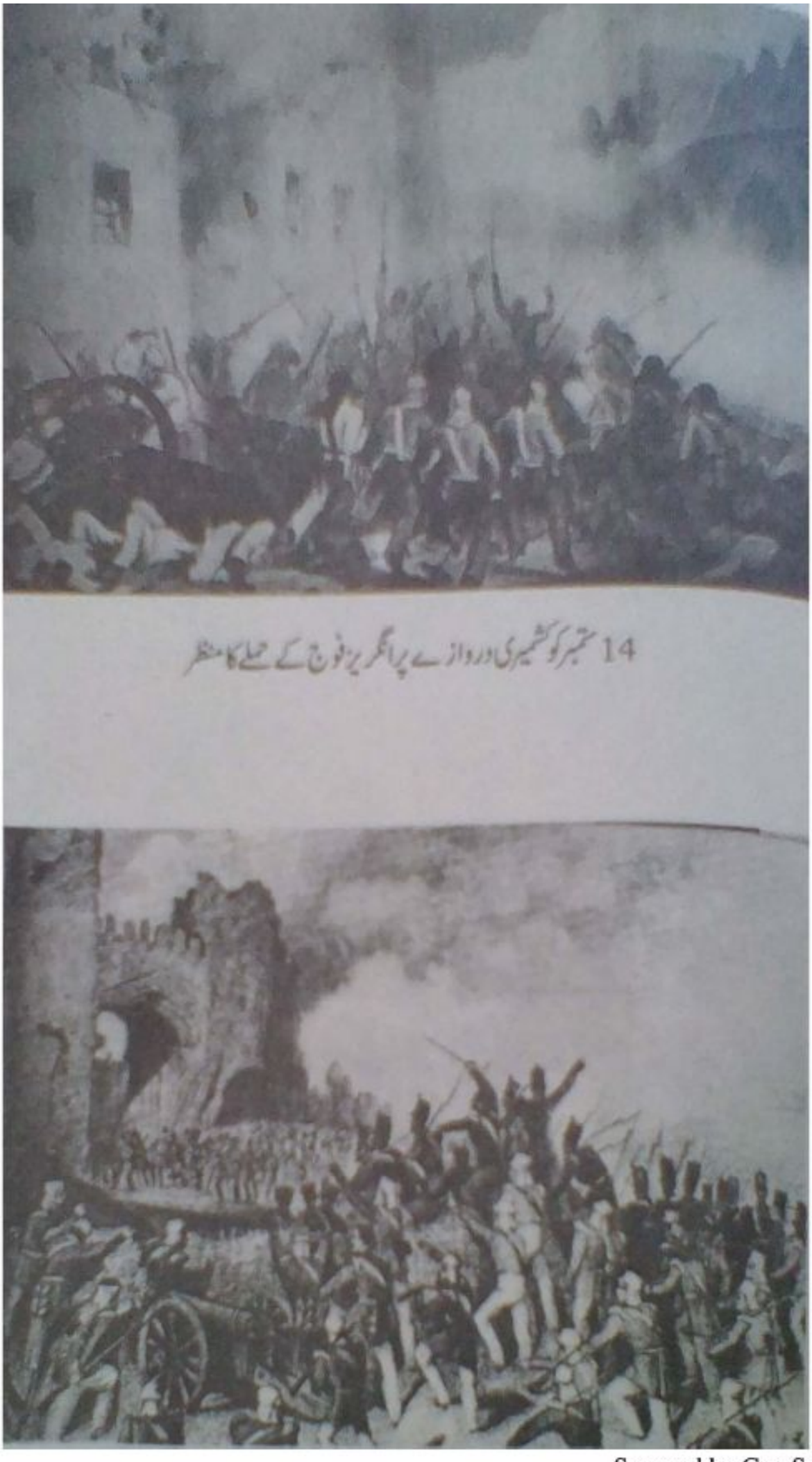

14 ستمبر کو کشمیری دروازے پر انگریز فوج کے حملے کا منظر

Scanned by CamScanner

Scanned by CamScanner

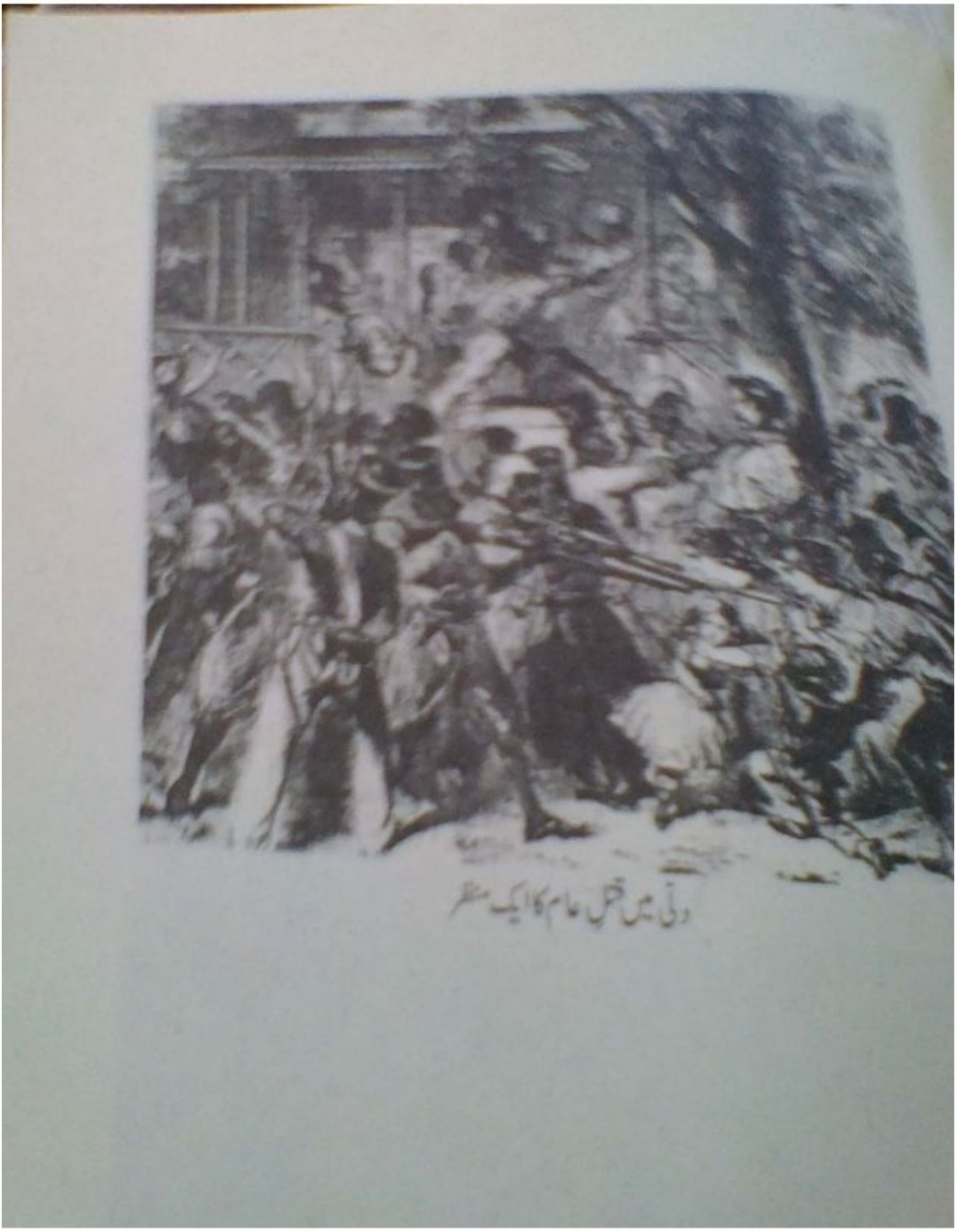

دلّی میں قتلِ عام کا ایک منظر

Scanned by CamScanner

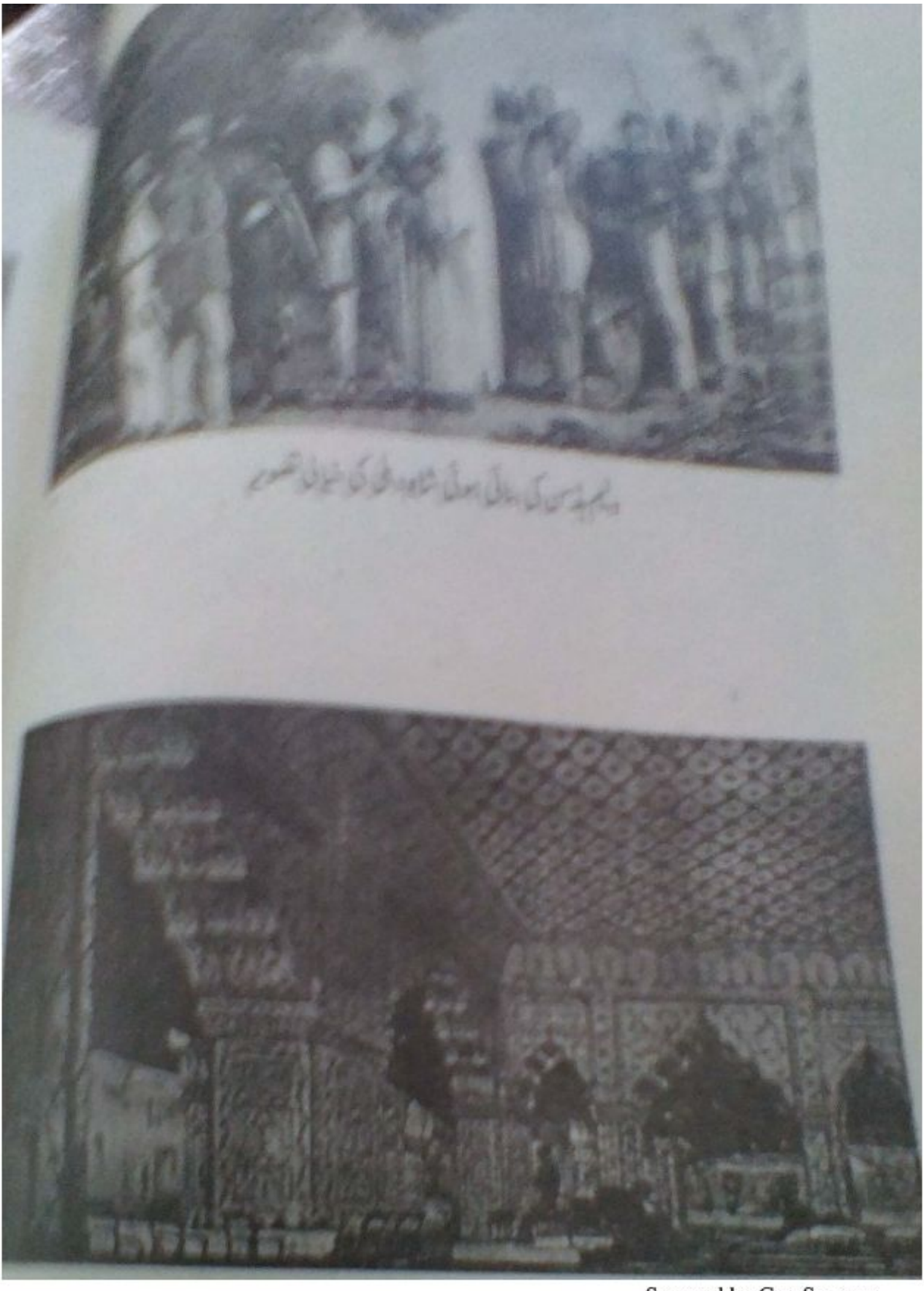

Scanned by CamScanner

کشتیوں کا پل

Scanned by CamScanner

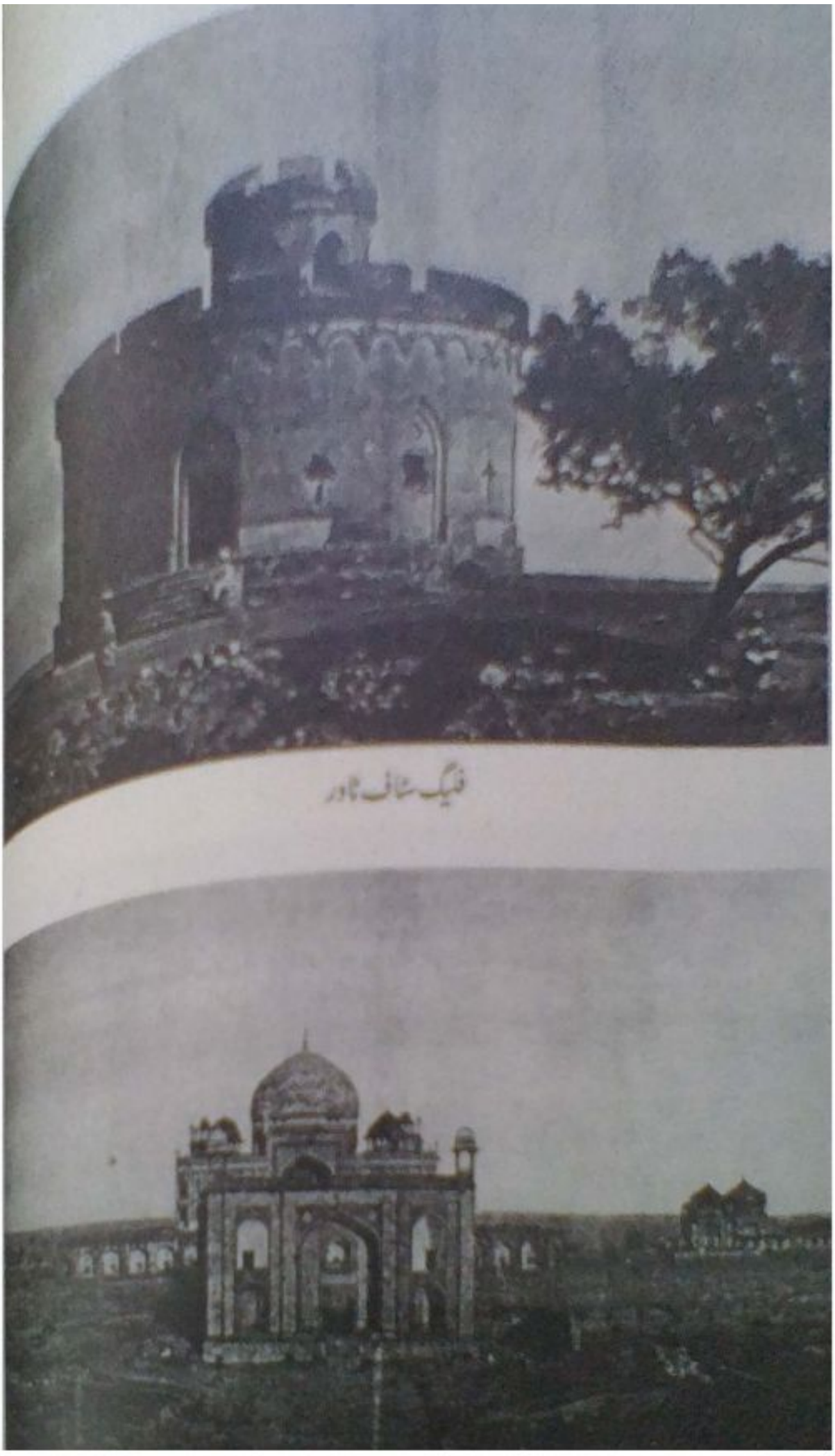

فلیگ سٹاف ٹاور

Scanned by CamScanner

Scanned by CamScanner

Scanned by CamScanner

Scanned by CamScanner

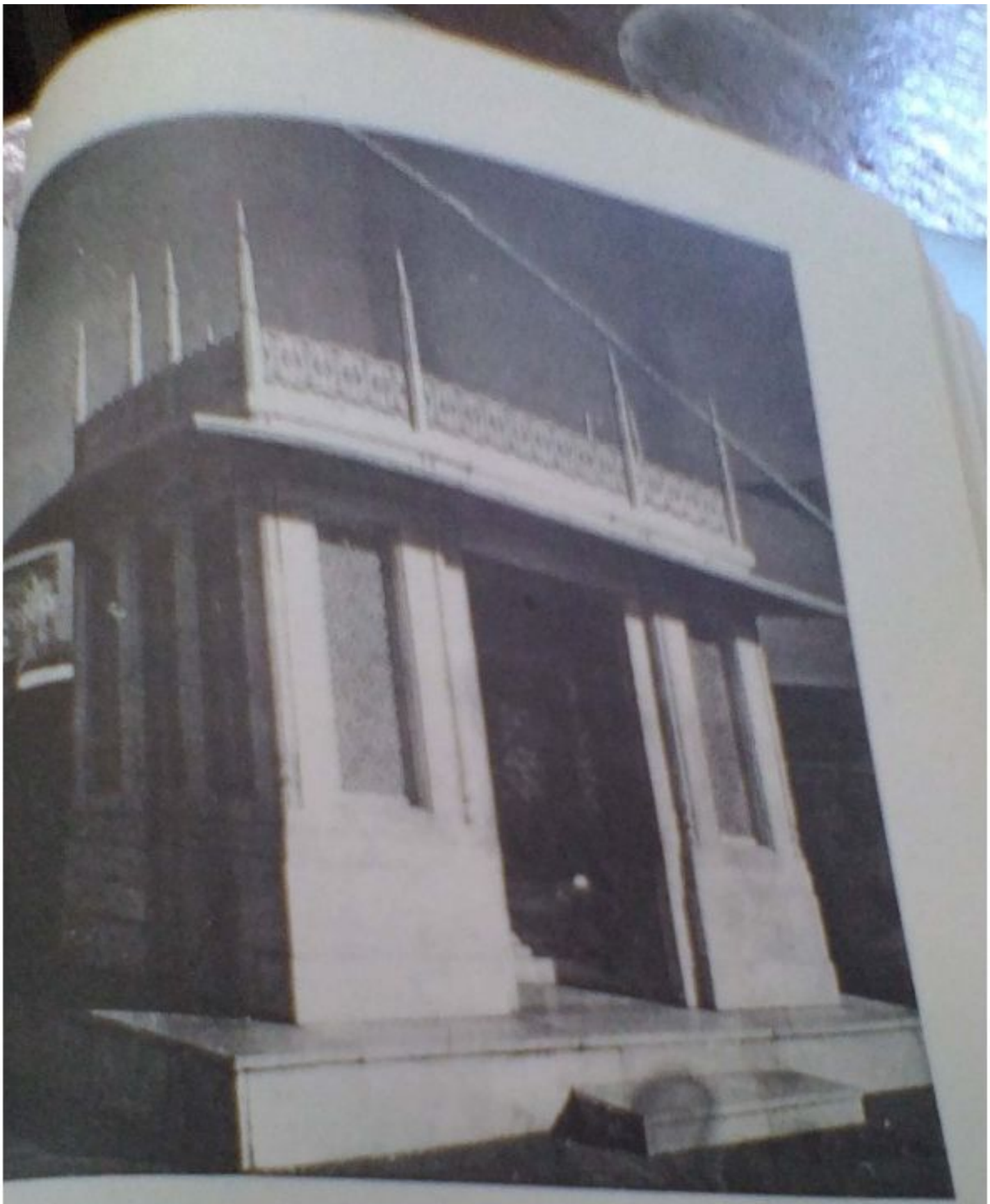

مقبرۂ غالب

Scanned by CamScanner

مدح کے چند عمومی محرکات

Allegorical literature exists in almost all languages of the world. A historical an dcultural study of the Ancient period is an evidence of the fact that during this period, human society was divided into three main social groups. One group was that of the Kings and rulers, the second of intellectuals and educationists and the third that of the lower class and slaves. With a slight difference even today, human society is still divided in the same socieal groups and hte motivations for producing allegorical literature in the historical, cultural and literary context. It also provides an analysis of its various types different linguistic periods.

قدیم انسان تنہا اور کمزور تھا۔ کائنات اور اس کی پر ہیبت اور جلالی اشیا کے بارے میں اس کی کم علمی نے اسے خوف میں مبتلا کر رکھا تھا۔ انواع و اقسام کی ذہنی اور فکری الجھنیں اس کا مقدر تھیں۔ فطرت کی غیر مسخر قوتوں نے اسے بے بس کر رکھا تھا۔ اسے خوراک کے حصول اور محفوظ مساکن کی تلاش میں دشوار ترین ماحول پر قابو حاصل کرنا اور صبر آزما مرحلوں سے گزرنا ہوتا تھا۔ اس کی کامیابیاں اور کامرانیاں اسے متکبر اور نرگسیت پسند بناتی تھیں

Scanned by CamScanner

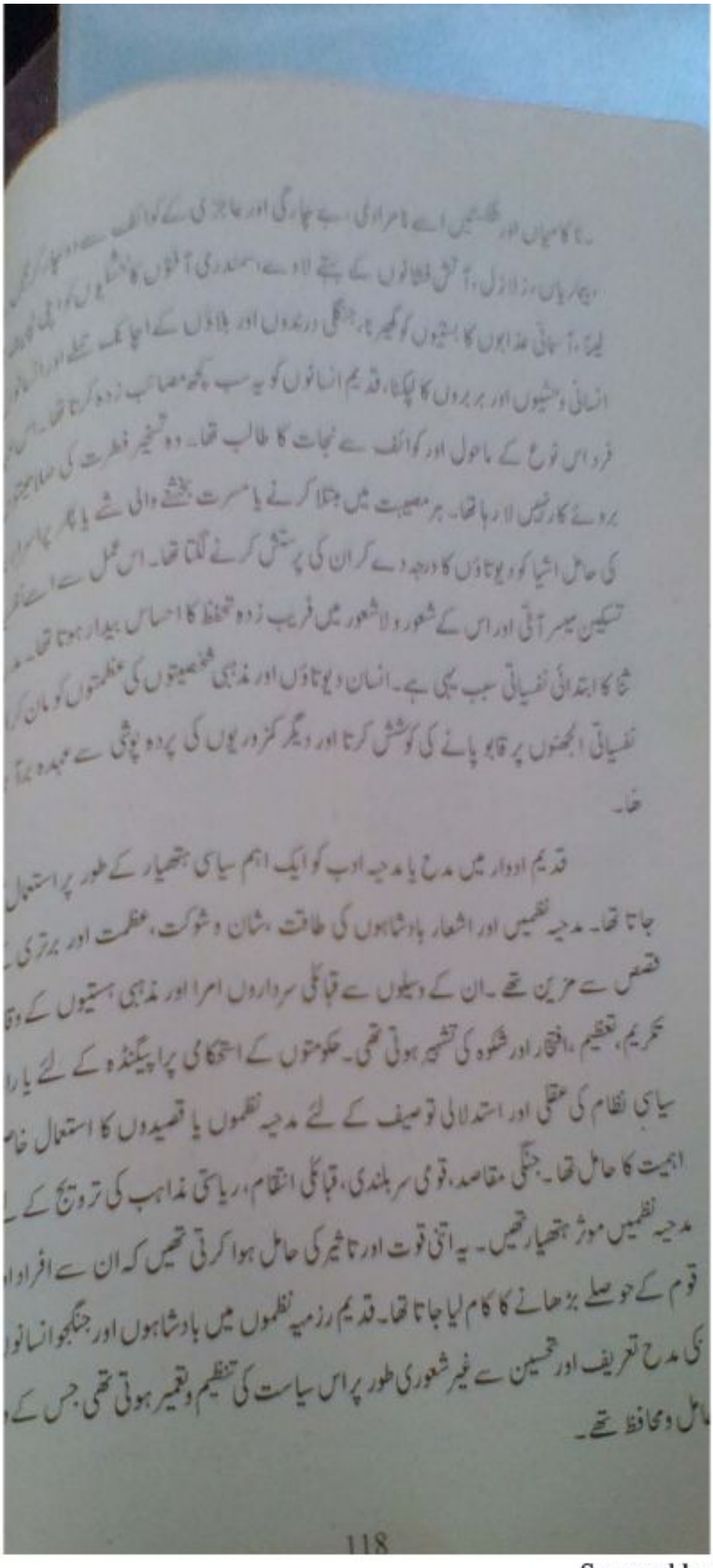

ناکامیوں اور شکستیں اسے نامرادی، بے چارگی اور عاجزی کے کوائف سے دوچار کرتی بیماریاں، زلزلے، آتش فشانوں کے پھٹتے لاوے، سمندری آفتوں، خشک سالیوں لیے، آسمانی عذابوں کا بستیوں کو گھیر لینا، جنگلی درندوں اور بلاؤں کے اچانک حملے اور انسانی وحشیوں اور بربروں کا لپکنا، قدیم انسانوں کو یہ سب کچھ مصائب زدہ کرتا تھا فرد اس نوع کے ماحول اور کوائف سے نجات کا طالب تھا۔ وہ تسخیر فطرت کی صلاحیت بروئے کار نہیں لا رہا تھا۔ ہر مصیبت میں مبتلا کرنے یا مسرت بخشنے والی شے یا کی حامل اشیا کو دیوتاؤں کا درجہ دے کر ان کی پرستش کرنے لگتا تھا۔ اس عمل سے اسے تسکین میسر آتی اور اس کے شعور و لاشعور میں فریب زدہ تحفظ کا احساس بیدار ہوتا تھا۔ شا کا ابتدائی نفسیاتی سبب یہی ہے۔ انسان دیوتاؤں اور مذہبی شخصیتوں کی عظمتوں کو مان کر نفسیاتی الجھنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتا اور دیگر کمزوریوں کی پردہ پوشی سے عہدہ برآ تھا۔

قدیم ادوار میں مدح یا مدحیہ ادب کو ایک اہم سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال جاتا تھا۔ مدحیہ نظمیں اور اشعار بادشاہوں کی طاقت، شان و شوکت، عظمت اور برتری قصص سے مزین تھے۔ ان کے وسیلوں سے قبائلی سرداروں امرا اور مذہبی ہستیوں کے وقا تکریم، تعظیم، افتخار اور شکوہ کی تشہیر ہوتی تھی۔ حکومتوں کے استحکامی پراپیگنڈہ کے لیے یا سیاسی نظام کی عقلی اور استدلالی توصیف کے لیے مدحیہ نظموں یا قصیدوں کا استعمال خا اہمیت کا حامل تھا۔ جنگی مقاصد، قومی سربلندی، قبائلی انتقام، ریاستی مذاہب کی ترویج کے مدحیہ نظمیں موثر ہتھیار تھیں۔ یہ اتنی قوت اور تاثیر کی حامل ہوا کرتی تھیں کہ ان سے افراد قوم کے حوصلے بڑھانے کا کام لیا جاتا تھا۔ قدیم رزمیہ نظموں میں بادشاہوں اور جنگجو انسانو کی مدح تعریف اور تحسین سے غیر شعوری طور پر اس سیاست کی تنظیم و تعمیر ہوتی تھی جس کے امل و محافظ تھے۔

Scanned by CamScanner

شاہی ریاستوں میں درباری شعرا کئی قسم کے مقاصد پورے کرتے تھے۔ وہ اپنی قصیدوں کے وسیلے سے مروجہ نظام حکومت و سیاست کو درباریوں اور شہریوں کے اذہان میں فکری طور پر رائج کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ اس نظام کو ابدی قدروں کا حامل قرار دیتے تھے۔ شاہی قوانین کو خدائی قوانین سے منسوب کر کے بادشاہوں اور حاکموں کی مطلق العنانیوں پر فکری اور جذباتی خول چڑھ جاتے تھے۔ بادشاہ اور حکمران اس کے عوضانے کے طور پر انھیں بیش قیمت انعامات سے نوازتے تھے۔ یوں شاعروں کے ضمیروں میں موجود آزادی اظہار کی تمنائیں دب جاتی تھیں۔ ان کی دیکھا دیکھی نئے طالع آزما شاعر درباروں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور مروجہ نظام حکومت کی چیرہ دستیوں اور حکمرانوں کے مظالم کے خلاف آواز صداقت بلند کرنے کی جرائتیں خاموشیوں کی گہری اندھی قبروں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن ہو جاتی تھیں۔ البتہ کبھی کبھی جب شاعروں سے بادشاہ یا بادشاہ سے شاعر ناراض ہو جاتے تھے تو وہ ہجویہ شاعری کی جانب رجوع کرتے تھے۔

مدحیہ شاعری کی مزید سیاسی افادیت یہ تھی کہ اس میں حکومتوں اور حکمرانوں کا تاریخی، سیاسی اور احوالاتی ریکارڈ محفوظ ہو جاتا تھا۔ کسی عہد کی مخصوص معاشرتی رسوم اور عقائد کا ذخیرہ ان کے وسیلے سے بھی قارئین تک پہنچا ہے۔ ان میں متعلقہ ادوار کے معاشرتی رویے اور رجحانات عکس فگن نظر آتے ہیں۔ رائج علوم وفنون کی اہم جزئیات کی خبریں ملتی ہیں۔ دنیا کے مختلف سیاسی نظاموں اور رنگارنگ معاشرتوں میں موجود اخلاقی اور عمومی رویوں کے اثاثے ان مدحیہ نظموں کے اشعار میں منعکس ہوئے ہیں۔ بوقلموں ثقافتی ماحولوں کی بھرپور عکاسی ہاتھ لگتی ہے۔ متنوع معاشرتی نظاموں کی ایسی جزئیات کا ذخیرہ میسر آتا ہے جسے شاعروں نے زباتی، تخیلاتی اور مشاہداتی تناظر میں جمع کیا تھا۔ ان نظموں کی اہمیت یہ بھی تھی کہ ان میں شاہوں، امیروں اور قبائلی سرداروں کے جو مثالی کردار پیش کیے جاتے تھے بسا اوقات ان ممدوحین کے شعور اور رویے میں نمایاں تبدیلیاں آتی تھیں اور جب بخیلوں، ظالموں، غیر

Scanned by CamScanner

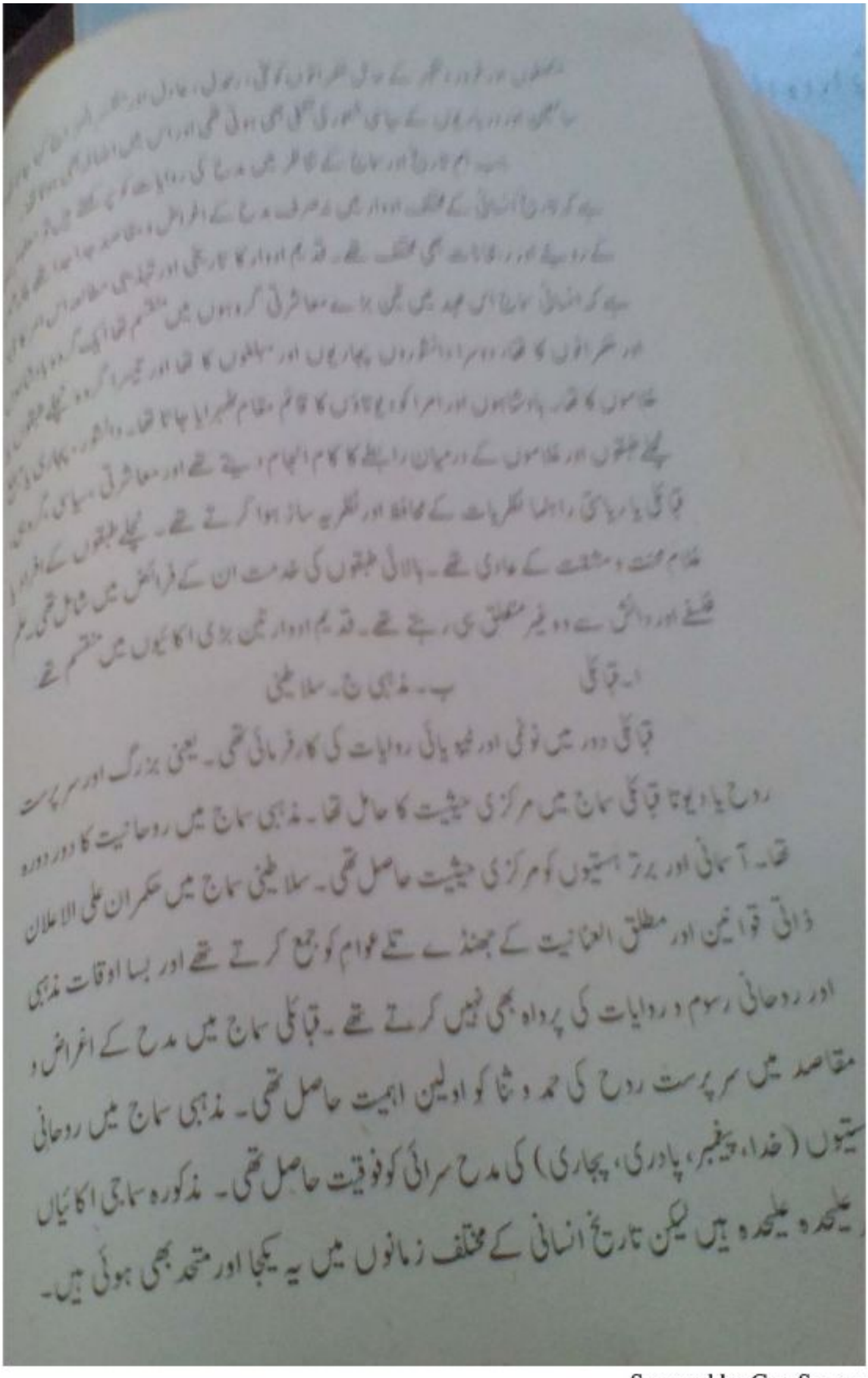

کاہنوں اور [illegible] کے [illegible] حکمرانوں کو کبھی [illegible] اور [illegible]

ساتھ ہی [illegible] کے [illegible] کبھی ہوتی تھی اور اس میں [illegible]

ہے [illegible] کے لحاظ میں مدح کی روایات [illegible]

ہے کہ تاریخ انسانی کے مختلف ادوار میں [illegible] مدح کے اغراض و [illegible]

کے رویے اور روایات بھی مختلف تھے۔ قدیم ادوار کا تاریخی اور تہذیبی مطالعہ [illegible]

ہے کہ انسانی سماج اس عہد میں تین بڑے معاشرتی گروہوں میں منقسم تھا۔ ایک گروہ [illegible]

اور حکمرانوں کا تھا۔ دوسرا دانشوروں، پجاریوں اور کاہنوں کا تھا اور تیسرا گروہ [illegible]

غلاموں کا تھا۔ بادشاہوں اور امرا کو دیوتاؤں کا قائم مقام تصور کیا جاتا تھا۔ [illegible]

بیچ کے طبقوں اور غلاموں کے درمیان رابطے کا کام انجام دیتے تھے اور معاشرتی، سیاسی [illegible]

قبائلی یا مذہبی روایات نظریات کے محافظ اور نظریہ ساز ہوا کرتے تھے۔ نچلے طبقوں کے [illegible]

غلام محنت و مشقت کے عادی تھے۔ بالائی طبقوں کی خدمت ان کے فرائض میں شامل تھی۔ [illegible]

فلسفے اور دانش سے وہ غیر متعلق ہی رہتے تھے۔ قدیم ادوار تین بڑی اکائیوں میں منقسم تھے

ا۔ قبائلی ب۔ مذہبی ج۔ سلاطینی

قبائلی دور میں قومی اور عمومی روایات کی کارفرمائی تھی۔ یعنی بزرگ اور سرپرست روح یا دیوتا قبائلی سماج میں مرکزی حیثیت کا حامل تھا۔ مذہبی سماج میں روحانیت کا دور دورہ تھا۔ آسمانی اور برتر ہستیوں کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ سلاطینی سماج میں حکمران علی الاعلان ذاتی قوانین اور مطلق العنانیت کے جھنڈے تلے عوام کو جمع کرتے تھے اور بسا اوقات مذہبی اور روحانی رسوم و روایات کی پرواہ بھی نہیں کرتے تھے۔ قبائلی سماج میں مدح کے اغراض و مقاصد میں سرپرست روح کی حمد و ثنا کو اولین اہمیت حاصل تھی۔ مذہبی سماج میں روحانی ہستیوں (خدا، پیغمبر، پادری، پجاری) کی مدح سرائی کو فوقیت حاصل تھی۔ مذکورہ سماجی اکائیاں علیحدہ علیحدہ ہیں لیکن تاریخ انسانی کے مختلف زمانوں میں یہ یکجا اور متحد بھی ہوئی ہیں۔

Scanned by CamScanner

چنانچہ اکثر سماج یا تو قبائلی مذہبی سماج تھے یا سلاطینی مذہبی۔ سلاطینی سماج میں قبائلی اور مذہبی روایات کی گرہیں نظر آتی ہیں اور مذہبی سماجوں میں سلاطینی اور قبائلی روایات کے ستارے چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔

قدیم سماجوں کی کلی یا جزوی صورتوں میں امرا کا طبقہ ہی حقیقی حکمران ہوا کرتا تھا۔ ان کے پاس طاقت بھی ہوتی تھی اور دنیاوی اور مادی اسباب کی کثرت بھی۔ انہی اثاثوں کی بدولت انہیں سماج میں بلند مقام حاصل تھا۔ غلاموں یا نچلے طبقوں کے افراد کو تعریف و تحسین کا مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بسا اوقات غلام اور نچلے طبقے کے افراد بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیتے تھے لیکن مدح کے مستحق امرا یا ان کے آقا ہی ہوا کرتے تھے۔ جدید ادوار میں جہاں اقتدار عوام اور وسیع تر طبقوں کے ہاتھوں میں ہے وہاں عوامی کارناموں کی بیڑی اور شعری مدحیں عروج پر نظر آتی ہیں۔ قدیم عہد میں شعرا کی مدحیہ تخلیقات آقاؤں اور امرا کے نظری و عملی مقاصد کی تفاسیر ہوا کرتی تھیں۔ شعرا یا تو خود بالائی طبقوں سے متعلق تھے یا پھر ان طبقوں کے عطا کردہ زر و سیم کی بدولت معاشرے میں اہم مقام حاصل کر لیتے تھے۔ ہماری تاریخ میں (اردو ادب) قرض کی مے پینے والے جو شاعر نظر آتے ہیں ان کے بارے میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس دور سے تعلق رکھتے تھے جب امرا کیا حکمران بھی فرنگیوں کے تابع ہو چکے تھے اور شاہی خزانہ سرکاری وظیفوں کی روداد کہتا تھا۔ قدیم درباری شعرا کو اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ جن آقاؤں کے وہ مدح سرا ہیں انہوں نے لاکھوں انسانوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ وہ باربرداری کے جانور بن چکے ہیں اور انسانوں کی بجائے اشیائے استعمال بن کر رہ گئے ہیں (ملاحظہ ہو اہرام مصر کی تعمیر میں مصروف غلام بحوالہ نظر نامہ از محمود نظامی) اور ان پر ہونے والے تشدد کا منظر نامہ۔ قدیم ادوار میں بھی شاعر اور دانشور اپنے ممدوحین کی قربتیں حاصل کرنا چاہتے تھے اس کے لئے حسد و رقابت کا بازار بھی گرم ہوتا تھا۔ ذاتی چپقلشیں اور آپس کے معرکے (لٹھ بردار بھی) بھی دیکھنے میں

Scanned by CamScanner

آتے تھے۔

پروفیسر کرار حسین نے اپنے ایک مضمون میں پرانے قصیدہ گو شعرا کے

حق میں تاریخی، عقلی اور سماجی جواز پیش کیا ہے۔ اس مرحلے پر ان کے نقطۂ نظر کو جاننا

ہے تاکہ ہم عربی، فارسی اور اردو کے قدیم قصائد کے لئے ہمعصرانہ تنقیدی معیار حاصل کر سکیں۔

کرار حسین لکھتے ہیں (امیر خسرو کے عہد میں)

"سلطان کی شخصیت سے قطع نظر سلطنت کے متعلق عقیدہ یہ تھا کہ وہ نہ صرف ایک ضروری بلکہ مقدس ادارہ ہے اور سلطان اس کا نمائندہ ہے۔ اس کی شخصی علامت ہے۔ سلطنت نہ صرف بربریت کے خلاف تہذیب کے چاروں طرف فساد کے خلاف تکوین کے چاروں طرف ایک حصار ہے بلکہ وہ اس نظام عدل کا دنیوی نمونہ ہے جس پر خدا کی کائنات قائم ہے۔ اسی سے شوکت اسلام وابستہ ہے۔

مصلحت در دین عیسیٰ غار و کوہ

مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ

عقیدہ کے لئے علامت اور حقیقت کی دوئی مٹانا کوئی مشکل امر نہیں جتنے قصیدے فارسی اور اردو میں لکھے گئے ہیں تم ان میں ممدوح کے ذاتی کردار کی طرف کوئی اشارہ نہیں پاؤ گے بلکہ قصیدہ کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ قصیدہ ایک سلطان کی جلالی صفت یعنی شجاعت اور اس کی جمالی صفت یعنی سخاوت کے حضور فن و شعر کی طرف سے ایک خراج عقیدت ہے۔ یہ کسی سلطان کا تشخص اس کی IDENTITY نہیں ہے بلکہ ہر سلطان کی IDENTIFICATION کے لئے ایک مثال یا تمثیل یا امیج ہے"(۱)

کرتے ہیں جسے اس عہد کے دربار کو ثقافتی مرکز قرار دیا ہے ان کا کہنا ہے

"اس زمانے کا دربار ایک ثقافتی مرکز بھی تھا۔ بادشاہ اور امرا شعر و فن کی سرپرستی کو اپنا فرض سمجھتے تھے اور ساری مہذب دنیا میں شعر و فن کی قدر و قیمت کے لئے بھی ایک بازار تھا۔ لوک گیت اور کہانیوں کے علاوہ باشعور ادب کے مرکز دربار اور خانقاہ ہی تھے۔ درباری شاعر سلطان کے قصیدے لکھتا تھا بالکل جس طرح ملک اور قوم کے استحکام کے لئے اپنی صلاحیتوں کو صرف کرنا آج کل کے ادیب کا فرض ہے اور کچھ تاریخی واقعات پر نظمیں بھی لکھتا تھا جس طرح حکومتوں کا پبلسٹی کا محکمہ کام کرتا ہے"(۲)

مذکورہ حوالے سے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ صنف قصیدہ قدیم عہد کی بادشاہت (نظام بادشاہت) کے لئے ایک موثر ہتھیار تھا۔ شاعر اس صنف میں ایک طرز حکومت اور ایک طرز زندگی کو سراہتا تھا۔ اچھا شاعر امرا یا بادشاہ کی کٹھ پتلی نہیں ہوتا تھا۔ وہ شعر کو فن کا پردہ کرتا تھا اور اسے اپنا فن بناتا تھا۔ شعرا بادشاہوں کو نصیحتیں بھی کرتے تھے اور کہتے تھے وہ دنیا میں ایسے کام کریں جن سے ان کی آخرت سنورے۔ وہ بادشاہوں کو موت اور فنا کے تصورات کے حوالے سے باور کروا دیا کرتے تھے کہ انسان دنیا میں خاک کا ذرہ اور پانی کا بلبلہ ہے۔ اس لئے جہاں تک ہو سکے دنیا میں ظلم سے گریز کرے اور مستحقین تک ان کا حق پہنچائے۔

صنف قصیدہ کی ماہیت پر علمی بنیادوں کے حوالے سے تو ہمارے تذکرہ نگاروں محققوں اور نقادوں نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن محض علمی حوالے سے ہم کسی فنی مسئلے یا معاملے کے تمام تر متعلقات کی نشاندہی نہیں کر پاتے۔ اس تناظر میں اس کی احوالاتی بنیادوں تک رسائی ناگزیر ہے۔ ویسے بھی علم یا سائنس کا تعلق تجرباتی آزمائشوں سے ہوتا ہے۔ جب کہ فن

Scanned by CamScanner

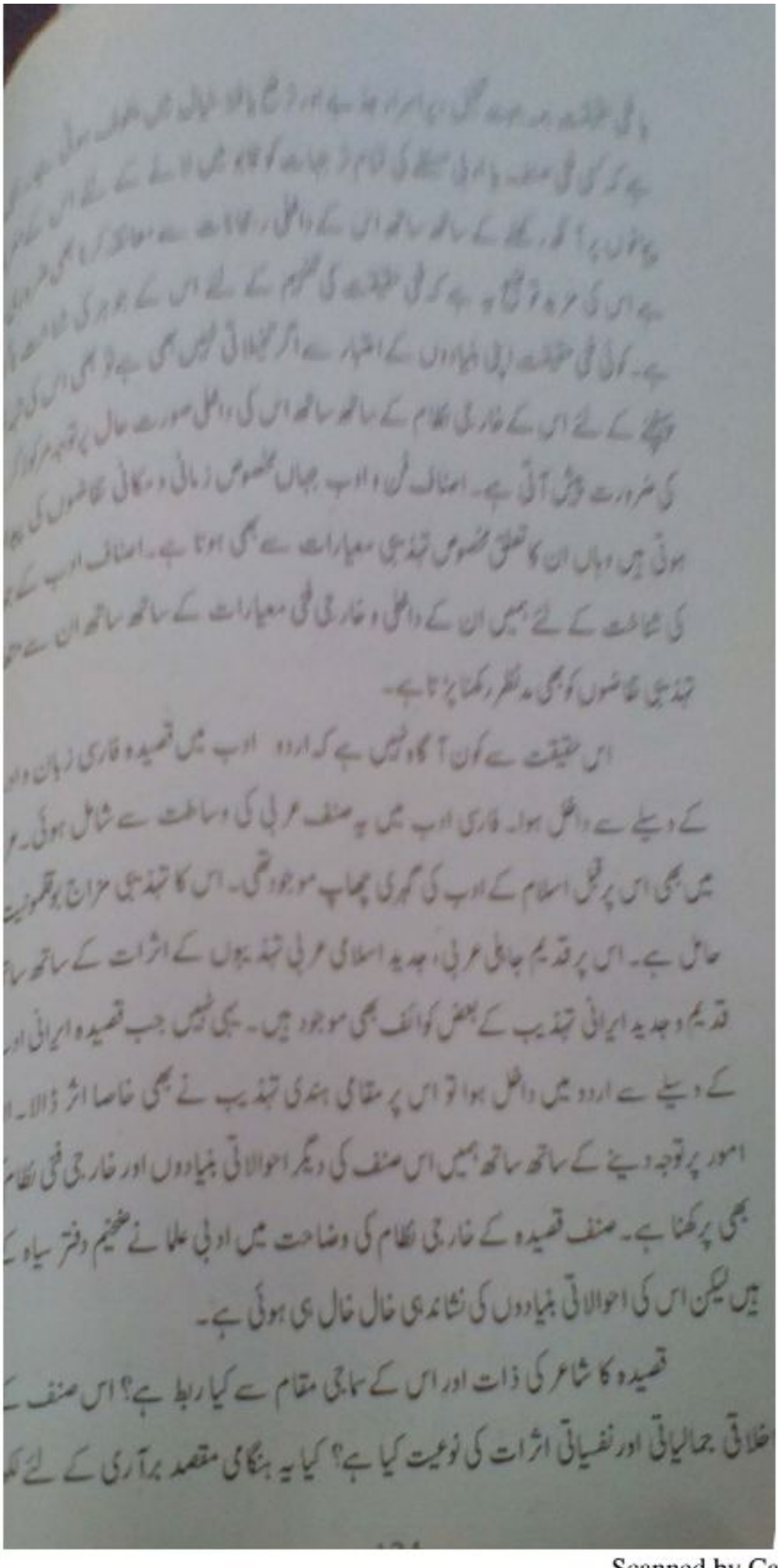

ادبی حقیقت بن جاتی ہے یہ امر اہم ہے اور توضیح طلب بھی ہے

ہے کہ کوئی بھی صنف، ادبی تشکیل کی تمام تر جہات کو کلام میں لانے کے لیے

جاتوں پر انحصار رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے داخلی روابط سے معاملہ کرتی بھی

ہے اس کی مزید توضیح یہ ہے کہ ادبی حقیقت کی تفہیم کے لیے اس کے جوہر کی شناخت

ہے۔ کوئی بھی حقیقت اپنی بنیادوں کے اعتبار سے اگر تخلیقی نہیں بھی ہے تو بھی اس کی

پرکھ کے لیے اس کے خارجی نظام کے ساتھ ساتھ اس کی داخلی صورت حال پر توجہ مرکوز

کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اصناف فن و ادب جہاں مخصوص زمانی و مکانی تقاضوں کی پیداوار

ہوتی ہیں وہاں ان کا تعلق مخصوص تہذیبی معیارات سے بھی ہوتا ہے۔ اصناف ادب کے

کی شناخت کے لیے ہمیں ان کے داخلی و خارجی فنی معیارات کے ساتھ ساتھ ان سے

تہذیبی تقاضوں کو بھی مد نظر رکھنا پڑتا ہے۔

اس حقیقت سے کون آگاہ نہیں ہے کہ اردو ادب میں قصیدہ فارسی زبان و ادب کے وسیلے سے داخل ہوا۔ فارسی ادب میں یہ صنف عربی کی وساطت سے شامل ہوئی۔ عربی میں بھی اس پر قبل اسلام کے ادب کی گہری چھاپ موجود تھی۔ اس کا تہذیبی مزاج بوقلمونیت کا حامل ہے۔ اس پر قدیم جاہلی عربی، جدید اسلامی عربی تہذیبوں کے اثرات کے ساتھ ساتھ قدیم و جدید ایرانی تہذیب کے بعض کوائف بھی موجود ہیں۔ یہی نہیں جب قصیدہ ایرانی ادب کے وسیلے سے اردو میں داخل ہوا تو اس پر مقامی ہندی تہذیب نے بھی خاصا اثر ڈالا۔ ان امور پر توجہ دینے کے ساتھ ساتھ ہمیں اس صنف کی دیگر احوالاتی بنیادوں اور خارجی فنی نظام کو بھی پرکھنا ہے۔ صنف قصیدہ کے خارجی نظام کی وضاحت میں ادبی علما نے ضخیم دفتر سیاہ کیے ہیں لیکن اس کی احوالاتی بنیادوں کی نشاندہی خال خال ہی ہوئی ہے۔

قصیدہ کا شاعر کی ذات اور اس کے سماجی مقام سے کیا ربط ہے؟ اس صنف کے اخلاقی، جمالیاتی اور نفسیاتی اثرات کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ ہنگامی مقصد برآری کے لیے لکھا

Scanned by CamScanner

ہے یا اس کی کوئی مستقل اہمیت بھی ہے؟ قصیدہ کا زمان و مکاں محدود ہے یا وسیع؟ اس کی عارضی اور داخلی کلیت ترکیبی کلیت ہے یا منتشر کلیت؟ اس کی مابعد الطبیعاتی، تاریخی، سیاسی اور تہذیبی اہمیت کیا ہے؟ اس تناظر میں اس کے امکانات کی کیا کیا صورتیں ہیں؟ اس کے جذباتی فکری اور فنی نظام کی حقیقت کیا ہے؟ کیا یہ صنف عقیدہ کی نشوونما کا ذریعہ ہے یا محض نمائش عقیدہ کا وسیلہ؟ قصیدہ کے کلاسیکی تنقیدی معیارات کس حد تک عصری ہیں اور اس کے عصری تنقیدی معیارات کس حد تک روا؟ ان سوالوں کا جواب ہمارے لئے قصیدہ فہمی کے نئے راستے تلاش کر سکتا ہے۔

یہ حقیقت اٹل ہے کہ دور جدید میں صنف قصیدہ اپنی اہمیت کھو چکی ہے۔ معاصر ادبی منظرنامہ شاہد ہے کہ اکا دکا نعتیہ یا منقبتی قصائد کے علاوہ اس صنف کی زنبیل میں اور کچھ نہیں ہے۔ بادشاہ، وزیر ریاستی نواب یا امرا کے زوال کے ساتھ قصیدے کے زوال کو بھی منتہی کیا جاتا ہے اور یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ خدا، رسول، خلفا، آئمہ اور پیروں، فقیروں سے ہمارے شعرا کی گہری وابستگی ہے مگر مذہبی قصیدہ بھی آج تعداد میں اتنا کم لکھا جا رہا ہے کہ اس پر الشاذ کالمعدوم ہی کا اطلاق ہونا چاہئے۔ اس کی بنیادی وجہ جدید دور کی شاعری میں در آنے والی نئی اصناف ہیں نظم معری، نظم آزاد اور نثری نظم کے دائروں میں سفر کرنے والے شعرا کے لئے قدیم اظہاریاتی وسائل سے استفادہ کرنا امر محال ہے۔ ردیف و قوافی اور اوزان کی قید سے نجات پانے والے صنائع بدائع کی پرخار وادیوں میں قدم رکھنے سے گریزاں ہیں۔ قدیم شعری فنون اور کلاسیکی وسائل اظہار کی افادیت عہد جدید میں ختم ہو چکی ہے۔ نئی طرز کا اظہاراتی اظہار، شعور کی رو کا بہاؤ، اختلال حواس کی نئی تکنیکیں، دور از کار تلازماتی سلاسل، قواعد سے منحرف لسانی شکلیں اور ان کے ساتھ ساتھ سیدھے اور براہ راست اسالیب کا استعمال، عہد جدید کے شعرا کو قدیم شاعرانہ معیارات سے گریزاں رہنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اگرچہ صنف قصیدہ اپنی مقصدیت کھو چکی ہے تاہم اس کے شاندار ماضی اور اس کی عظیم

Scanned by CamScanner

شعری روایات کو اسی طرح کی عظیم عمارتوں سے دیکھا جا سکتا ہے جس طرح سے عام بھی ...
الشان تعمیرات یا کلاسیکی معیارات کی حامل پرجلال مصوروں کا شاہکار دیکھتے ...
عمارات اور پرانے مصوروں کی بنائی ہوئی تصاویر عہد نو کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی ...
سے ہم آہنگ نہیں ہیں، لیکن ان کی تاریخی، روایاتی اور مطالعاتی اہمیت سے انکار ممکن ...
صنف قصیدہ پر ہمارے تمام تر مباحث اسی تناظر میں ہیں۔ یہ صنف ہمارے ادب میں ...
ہی اہمیت کی حامل ہے جیسی فن تعمیر میں تاج محل، لال قلعہ یا مسجد وزیر خاں۔ نئے دور ...
تعمیر میں ان عمارات میں استعمال ہونے والے میٹیریل، صناعی اور تعمیری قواعد و ضوابط ...
طاق نہیں رکھا گیا۔ تاہم یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ آج کے دور میں ان کی اہمیت مکمل طور ...
ہو گئی ہے۔ صنف قصیدہ سے انصاف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم اسے مذکورہ معروضات ...
روشنی میں پرکھیں۔ اس مقام پر ہم ان سوالوں کے اجمالی جواب تلاش کرنے کی کوشش کر ...
ہیں جو اس صنف کی اصولاتی بنیادیں دریافت کرنے کے حوالے سے ہمارے سامنے آ ...
ہیں۔ کیا قصیدہ بادشاہ، امیر، قبائلی سردار، روحانی شخصیت، سماجی اخلاق کی ضرورت ہے یا شا...
کی؟ اس سوال کا جواب دیگر سوالوں کے جوابات میں آسانی پیدا کرے گا۔

جہاں تک بادشاہوں، امیروں اور قبائلی سرداروں کا تعلق ہے ایسی ان گن...
شہادتیں موجود ہیں جن سے استنباط ہوتا ہے کہ وہ ذاتی نام و نمود یا اپنے کارناموں کو حیا...
جاوید بخشنے کے لئے شاعروں کو ایک ضرورت کے طور پر قبول کرتے تھے۔ عرب سردارو...
قبیلے میں شاعر کی پیدائش پر خوشی منانا (۳)، بادشاہوں کا اپنے درباروں میں ملک الشعرا...
منصب قائم کرنا اور امرا کا شاعروں کو اپنے حلقہ اثر میں شامل کرنا اس امر کی دلالت ہے ...
اولین سطح پر ممدوحین کو شاعروں کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ...
وقات شاعر بھی اپنے معاشی اور سماجی حالات کی دگرگونی سے تنگ آ کر عازم دربار ہوا کر...
ے۔ انعام و اکرام کی بارش یا صلے کی چاٹ انہیں مداحی پر مجبور کرتی تھی۔ یوں یہ صنف بعض...

Scanned by CamScanner

ان عروں کی ضرورت بن جاتی تھی۔ کئی شعرا صلے کی تمنا یا کسی اور نوع کے خارجی دباؤ کے بغیر بھی مدحیہ قصائد لکھ لیتے تھے۔ یہ ان کی طبعی پسند ناپسند کا مسئلہ تھا۔ جہاں تک روحانی شخصیات اور مذہبی ہستیوں کی مدح میں لکھے گئے قصائد کا تعلق ہے تو اس ضمن میں یہ کہنا کافی ہے کہ عربی، فارسی اور اردو قصیدہ گو شعرا کی غالب اکثریت کا تہذیبی مزاج مذہبی تھا۔ ان کے قلم سے نکلنے والے مذہبی قصائد ان کی ایمانی اور اعتقاداتی ضرورتوں کے تابع تھے۔ پیر، صوفی، بزرگ، ولی، امام، خلیفہ، پیغمبر، بذاتہ ایسے مقامات کے حامل ہوتے ہیں کہ انہیں مدح کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ وہ سلطنت کے وجم سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ البتہ ان کی مدح و ثنا انفرادی اور اجتماعی افادیت کی حامل ہوا کرتی ہے۔ انفرادی سطح پر شاعر اپنے دینی، مذہبی اور صوفی ہیرو کے کردار اور سیرت کی تعریف کرتے ہوئے اپنے باطن کو بھی اعلیٰ اخلاقی اقدار کے ذخائر سے مالا مال کرتا ہے اور اجتماعی سطح پر ان کے اعلیٰ اوصاف سبق آموز اور قابل تقلید ہوتے ہیں۔ حمد، نعت اور منقبت کے قصائد شاعروں کی اخلاقی اور دینی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ ان میں ہر نوع کے عذاب سے چھٹکارے، شفایابی اور حصول مقام و مرتبہ کی دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ مذہبی قصائد میں مذہبی ہستی یا شخصیت کی عظمت کا اعتراف اگر جذبات صادق سے بہرہ مند ہو کر کیا جاتا ہے تو قصیدہ نگار و قارئین سرمدی راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ اعلیٰ مذہبی قصائد علم و آگہی، شعور و عرفان اور بصیرت و ایمان کی روشنی رکھنے کے ساتھ ساتھ شاعرانہ کمالات کے عمدہ نمونے بھی ہوتے ہیں۔ نعت و منقبت کے قصائد شاعروں کے دلوں، روحوں اور ضمیروں میں موجزن عشق و شعور کے دائمی جذبات کے ترجمان ہوا کرتے ہیں۔ بلند پایہ نعتیہ، حمدیہ اور منقبتی قصائد میں لفظ و معانی اور اسلوب و شعور کی ہم آہنگی فکر خیزی کا باعث ہے۔ اس میدان میں وہی شعرا قدم رکھتے ہیں جن کے دل حرارت ایمانی کی آماجگاہ ہوتے ہیں۔ نعتیہ قصائد میں شاعروں کی عقیدت اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ نعتیہ قصیدے لکھنے والے شعرا ایک سطح پر بوسیلہ ممدوح انسانی سماج کی حقیقی، اخلاقی اور انسانی صورتوں کو منعکس کر رہے ہوتے ہیں تو

Scanned by CamScanner

دوسری سطح پر انفرادی ایمان کے شاہد ہوا کرتے ہیں۔ اس میدان میں کم تر درجے کے شعرا کامیاب نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ ان کی شاعری میں لفظ و معانی کے اعتدال کا فقدان ہوتا ہے۔ محمد نجف علی خاں مراد آبادی کا کہنا ہے "ایسا نہ ہو کہ محاورہ میں جو کلمات حمد و نعت میں لکھے جاتے ہیں وہ سلاطین اور امرا کی مدح میں لکھے جائیں اور ایسے ہی برعکس اس باب میں تمیز شرط ہے" (۴) یوں دیکھا جائے تو مذہبی قصائد شاعر کی ضرورت ٹھہرتے ہیں، مذہبی شخصیت کی نہیں۔ ان کے وسیلے سے وہ خیر و برکات بھی حاصل کرتا ہے اور فکری و روحانی گہرائیوں کی پر مایہ اقلیم بھی۔

جہاں تک سماجی اخلاق کا تعلق ہے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ جھوٹ، منافقت اور ریا کاری کے رجحانات تہذیبی، اخلاقی اور سماجی سانچوں کے لئے ضرر رساں ہیں۔ یہی سبب ہے کہ علمانے صرف ایسی مداحی کو جائز قرار دیا ہے جو ممدوح کے استحقاقی تقاضے کے تابع ہو۔ ایسی مدح جو کسی کے حقیقی کارناموں کو سراہنے کے ضمن میں ہوگی منافقت، ریا کاری اور جھوٹ کے رویوں سے پاک ہوگی۔ اس نوع کی مدحیں سماجی اخلاق کی ضرورت ہوا کرتی ہیں۔ کسی تہذیب کو بالیدگی عطا کرنے میں بھی ممد ہوتی ہیں۔ اعلیٰ، ارفع اور افادیت کے حامل کارنامے سرانجام دینے والے افراد کی عظمتوں کو سلام کرنا سماج کو درست راہ دکھاتا ہے۔

اس مختصر سی تمہید میں ہم نے مذکورہ بالا سوالات کے اجمالی جواب دینے کی کوشش کی ہے اور یوں ان نتائج تک پہنچے ہیں کہ قصیدہ کا قصیدہ گو شاعر کی ذات اور سماجی مقام سے گہرا رابطہ ہے۔ اس کے اخلاقی، جمالیاتی اور نفسیاتی اثرات سے انکار ممکن نہیں ہے۔ حقیقی مدح پر مبنی قصائد کئی سطحوں پر قارئین اور شعرا پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کی رہنمائی ہوتی ہے۔ ان میں اعلیٰ سطح کا جمالیاتی ذوق بیدار ہوتا ہے۔ ان کی شخصیات میں کارنامے سرانجام دینے کی تمنائیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ قصائد جو جھوٹی مداحی پر مبنی ہوتے ہیں ان میں شاعرانہ خلوص کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ایسے قصائد ہنگامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ جن قصائد میں

Scanned by CamScanner

ممدوحین کی تخلیقی کرداری عظمتیں بھرپور شاعرانہ صداقت اور خلوص سے پیش کی جاتی ہیں ان کی مستقل اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

قصیدہ کا زمان و مکاں تو اس لحاظ سے محدود نہیں ہے کہ یہ دور جاہلی سے عصر حاضر (حمدیہ، نعتیہ، منقبتی قصائد) تک مستقل لکھا جا رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب حمد و نعت کے قصائد بھی خال خال نظر آتے ہیں تاہم مذہبی قصیدہ موجود ہے۔ البتہ دنیاوی ممدوحین کی شان میں لکھے جانے والے قصائد بادشاہوں اور ریاستی نوابوں کے ساتھ ہی رخصت ہو گئے ہیں۔ اس کے باوجود ہم کہہ سکتے کہ قصیدہ کا زمان و مکاں کسی بھی صورت محدود نہیں ہے۔ قصیدے کی ہیت میں دنیاوی یا مذہبی شخصیات کی شان میں اگر کچھ نہ بھی لکھا جائے تو بھی تعریف یا برائی کے جذبات کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ کسی کی تعریف کرنا کسی کی برائی کرنے ہی کی طرح سے انسان کا حقیقی اور فطری جذبہ ہے۔ یہ جذبہ برقرار رہے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ تعریف یا برائی کے رجحانات مخصوص یا متعینہ سانچوں کے پابند نہ ہوں۔ دنیا کے مختلف نظریاتی اور غیر نظریاتی ممالک اپنے اپنے کارناموں کی توصیف و تحسین کے لئے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات میں پراپیگنڈہ کرتے ہیں۔ اپنی پالیسیوں پر کتابیں لکھواتے ہیں۔ پمفلٹ چھاپ کر تقسیم کرتے ہیں۔ آج بھی سپاسنامے۔ تہنیت نامے، سہرے، تقریباتی نظمیں لکھی جا رہی ہیں۔ سیاسی پارٹیاں شاعروں کی خدمات حاصل کرتی ہیں۔ قومی لیڈروں، سیاسی شخصیتوں اور ملکی سربراہوں کی شان میں نظمیں، قطعے، غزلیں، رباعیاں، آزاد نظمیں اور معری نظمیں لکھی جا رہی ہیں۔

جہاں تک قصیدے کی مروجہ فارم کے حوالے سے داخلی اور خارجی کلیتوں کی ہم آہنگی کا تعلق ہے تو وہ قصائد جن میں اظہار خلوص، فن پر عبور اور مداحی کا حقیقی جواز ہو گا ان کی خارجی اور داخلی کلیت میں ہم آہنگی نظر آئے گی۔ متضاد صورتوں میں انتشاری کلیت ہی کا قصیدہ رقم ہو سکے گا۔ اس کا ہر جزو علیحدہ تو ہو گا ہی باہمد گر متضاد بھی دکھائی دے گا۔

قصائد کی مابعد الطبیعاتی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تہذیبی سطح

Scanned by CamScanner

پر اس صنف نے تسلیم و رضا کا درس دیا ہے۔ اپنی شخصیت اور ذات سے بالاتر کی ہستی کی تعریف انسانوں میں کسر نفسی کا رجحان پیدا کرتی ہے۔ ان کے اندر ماننے اور تسلیم کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مسلم تہذیب میں تسلیم و رضا کے رجحانات خصوصی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ قصائد کی تاریخی اہمیت غیر زوالی ہے۔ ان میں مادحین اور ممدوحین کی شخصیات کی لفظی تصویروں کے ساتھ ساتھ ان کے تاریخی ادوار کی چند تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ سیاسی اعتبار سے اردو، عربی اور فارسی قصائد نے ممدوحین کے استحکام کے لئے بطور تشہیری سلاسل اعانت کی ہے اور یہ ان کے لئے مناسب راہنمائی کا سبب بنے ہیں۔

قصیدے کی تہذیبی اہمیت کا کچھ ذکر ہو ہی چکا ہے یہاں یہ کہنا کافی ہے کہ یہ اہمیت مذہبی حوالے سے بھی ہے اور دنیاوی حوالے سے بھی۔ مذہبی حوالے سے اس صنف نے ایمان اور عقائد کے استحکام کا کام کیا ہے اور دنیاوی حوالے سے اس میں مختلف زمانوں کے تہذیبی ماحول کے نمایاں آثار محفوظ ہیں۔ مذہبی قصائد کے تناظر میں یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ کیا قصیدہ عقیدے کی نشوونما کا وسیلہ ہے یا نمائش عقیدہ کا ذریعہ؟ اس کا سیدھا سادا جواب تو یہ ہے کہ وہ قصیدہ نگار جو خلوص سے عاری اور لاتعلق ہو کر یا دوسروں کے عقائد کو محترم نہ جان کر مذہبی شخصیات کی مدح وثنا کریں گے تو ان کے ہاں عقیدہ نمائش تک ہی محدود رہے گا اور اس میں تعصب کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔ وہ قصیدہ جو خلوص اور جذب کے کوائف کے تابع ہو کر لکھا جائے گا عقیدے کی نشوونما اور اس کی توسیع میں ممد و معاون ہو گا۔ اس کی وجہ ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ یہ ایک عمومی اصول ہے کہ قارئین پر تاثیر میں ڈوبے اشعار کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ قصیدے کے کلاسیکی تنقیدی معیارات کے تناظر میں کہا جا سکتا ہے کہ اس صنف میں ارتقا کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کی غزلیہ ہیت کی زنجیروں اور اجزا کی کڑیوں کی گرفت خاصی مضبوط ہے۔ شاعر ان سے دامن چھڑا کر کسی اور ہیت کے میدان میں تو داخل ہو سکتا ہے یدے سے متعلق نہیں رہ سکتا۔ اگر قصیدہ موضوعاتی حوالے سے قصیدہ کہلاتا تو اس میں ارتقا

[illegible]

قصیدے کے ارکان کے حوالے سے شبلی نے لکھا ہے:

"مختلف شاعرانہ مضامین کے لیے قصیدہ سب سے زیادہ وسیع میدان ہے۔ مثنوی کے لیے مسلسل طول طویل قصہ کی ضرورت ہے۔ غزل میں چھوٹے چھوٹے مفرد خیالات ادا کیے جا سکتے ہیں۔ باقی ہر قسم کے مضامین جو ان دونوں قسموں کے بیچ ہیں وہ صرف قصیدہ کے ذریعے سے ادا کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً کوئی دوست جدا ہو رہا ہے، کسی نے کوئی بامروّت کا کام کیا ہے، کوئی موثر منظر نظر سے گزرا، کسی گروہ کے تمدن یا معاشرت کی تصویر کھینچنا ہے۔ اس قسم کے تمام مضامین صرف قصیدہ میں عمدگی سے ادا ہو سکتے ہیں۔" (۵)

شبلی نے بھی قصیدے کی ہیئت میں ترمیم کا مسئلہ پیش نظر نہیں رکھا۔ نظم آزاد اور نثری نظم کی ہمہ جہت آزادیوں کے زمانے میں قصیدہ کی ہیئتی پابندیاں خاصی تکلیف دہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر میں (دور جدید میں موجود اشتیاق کے حوالے سے) زیادہ قصائد نہیں لکھے جا رہے۔

قصیدہ عربی، فارسی اور اردو اصناف سخن میں ایک نادر، پر مغز اور شکوہ آشنا صنف سخن ہے۔ یہ قدیم ترین شعری صنف ہونے کے ساتھ ساتھ طویل ترین زمانی اور ادبی مسافت کے آثار سے مالا مال ہے۔ اس میں شاعرانہ تجربے کی بوقلموں صورتیں اور معانی آفرینی کی رنگارنگ

تاثیر میں منعکس ہوتی ہیں۔ اسی لیے شان و شوکت اور پرواز تخیل کے اظہار کے لیے خصوصی مقام کی حامل ہے۔ لفظی و معنوی خصائص کے حوالے سے اسے بجا طور پر ... الشان صنف سخن کہا جاتا ہے۔ یہ صنف اتنی ہی رفیع الشان ہے جتنے اس کے ممدوح ... رفیع الشان ہوتے ہیں۔ جس طرح کا شکوہ، وقار اور جلال ایک برگزیدہ اور برتر ... شہنشاہ اور اس کے دربار کا ہوتا ہے اس صنف میں اس قسم کے جلال و جمال سے ... میں آتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ قصیدہ بنیادی طور پر مدح کے لئے مخصوص ہے لیکن یہ کہنا کہ ... شاعر ہمیشہ صلہ حاصل کرنے کے لئے قصیدہ لکھتا تھا صنف سخن اور شاعر دونوں پر بہتان ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس صنف میں جلال و جمال کے عناصر دکھائی نہ دیتے اور اس میں محض ... اجر کا تعلق یا مطلب پرستی کا عنصر نظر آتا۔ یہ درست ہے کہ بعض قصیدہ گو شعرا نے قصیدہ کو ... معیشت کے سہارے کے بطور استعمال کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرتے تھے کہ جب تک الفاظ و معانی کا تاج محل وجود میں نہیں آئے گا وہ ممدوح کے نزدیک صلہ کے مستحق نہیں ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ صنف قصیدہ میں معیشت طلبی کو دوم اور شعر زیبی کو اول حیثیت حاصل رہی ہے۔ حمد، نعت اور منقبت کے قصائد کا تو معاملہ ہی الگ ہے۔ ان میں مدح کا بنیادی محرک شاعر کا ایمان اور عقیدہ ہے۔ ان میں شاعر کی داخلی اور روحانی شخصیت پورے طور پر سرگرم عمل ہوتی ہے۔ اس لئے مذہبی قصائد معیشت سہارگی کے عیب سے کلیتاً بری ہیں۔

یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ قصیدہ کا ممدوح شاعرانہ مبالغہ کے تیروں کا ہدف بنتا ہے اور وہ اس کے لگائے ہوئے زخموں کو اپنی مدح کی تسکینی زبان سے ...ات کر سکون حاصل کرتا ہے۔ یہ بات عمومی عقل سے تعلق رکھتی ہے کہ جس مبالغہ تک ...ترضین کی رسائی آسانی سے ہے اسے ممدوح قصیدہ کیوں نہیں پا سکتا خصوصاً اس حوالے سے ...کہ قدیم عہد میں بادشاہ اور امراء علم، تہذیب اور شعور کی بلند سطحوں سے آشنا ہوتے تھے۔

ممدوح جانتا تھا کہ شاعر اس کی مدح میں مبالغہ آرائی سے کام لے رہا ہے۔ لیکن اس کے لیے شاعر کے موضوعات، مضامین، خیالات اور اسالیب اظہار اہم تھے۔ وہ شاعر کے شاعرانہ کمال کی شناخت کیا کرتا تھا۔ بغور دیکھا جائے تو مبالغہ ہی قصیدہ کی جان ہے۔ یہی وہ کوہ ہمالہ ہے جسے سر نہ کر سکنے کی وجہ سے قدیم و جدید شاعرانہ ادوار میں ہر کوئی قصیدہ نگار نہیں بن سکا۔ عقلی طور پر بالغ اور علمی طور پر فاضل ممدوحین کی مبالغہ آرائی پر مبنی مدح ان کی باطنی ضرورت نہ تھی۔ البتہ یہ شاعر کی حاجت ضرور تھی۔ یہ صنف ممدوح کی آزمائش نہیں مدح نگار کا امتحان ہے۔ مبالغہ کے ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی وضاحت دیکھیے

> "اگر اعتراض اس بات پر ہے کہ دور جاہلیت کے عربی قصیدوں میں تفاخر سے کام لیا جاتا تھا تو اعتراض میں قدرے وزن ہے۔ لیکن اس کے باوجود مبالغے کے تحت کچھ جذبات بھی موجود ہوتے تھے جو حقیقی شاعری کی شرط اول ہے۔ انداز بیان میں مبالغہ اور اغراق یونانی شعرا میں نیز انگریزی میں ملٹن وغیرہ کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ ارسطو نے اپنی کتاب علم بلاغت میں اسے بعض مواقع کے لئے جائز قرار دیا ہے"
> (٦)

یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ مدح کے حوالے سے قصائد میں ملنے والی مبالغہ آرائی کا کیا جواز ہے؟ یہ صدی جس میں ہم زندہ ہیں سائنسی معراج کی صدی ہے۔ سائنس کا انحصار تجربے اور مشاہدے پر ہے۔ سائنسدانوں نے ایسے محیر العقول کارنامے سرانجام دیے ہیں کہ داستان امیر حمزہ کا عمر بھی ورطہ حیرت میں ڈوبا ہے۔ اڑن کھٹولے، اڑنے والے قالین ،الہ دین کا چراغ، جام جہاں نما، کھل جا سم سم یہ سب کچھ سائنس آشنا صدیوں سے قبل کے انسانوں کا خواب تھا۔ آج نئے عہد کے انسانوں نے ان انسانوں کے خواب کی تعبیر اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ ہوائی جہاز، راکٹ، ریڈیو، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر وی سی آر اور کائنات کے

Scanned by CamScanner

راز ہائے سربستہ کے روز افزوں انکشافات، آج یہ سب کچھ مبالغہ نہیں حقیقت ہم جدید سائنس فکشن پڑھیں یا سائنس کے حوالے سے بننے والی فلمیں اور ڈرامے ہمیں مبالغہ کا قائل ہونا ہی پڑے گا۔ گزشتہ دنوں پاکستان ٹیلی ویژن پر سائنس فکشن سیریز کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ایک کا نام سکس ملین ڈالر مین ہے اور دوسری کا بائی اونک ان میں اول الذکر کا ہیرو مرد کردار اپنے جسم میں طاقت و شعور آفریں سائنسی آلات کے اور اسی طرح ثانی الذکر کی ہیروئن سائنسی ایجادات کی توانائیاں سمیٹ کر ایسے خیز کارنامے سرانجام دیتے ہیں کہ ہم جدید سائنسی داستانوں کے امیر حمزاؤں اور عمر عیاروں سے آشنا ہوتے ہیں۔ یوں ہم جان سکتے ہیں کہ انسان کو مبالغے سے کسی بھی دور میں نجات نہیں مل سکتی۔ کائنات کو مسخر کرنے کے لئے عجوبہ خواب تو دیکھنے ہی پڑیں گے۔ جب تک انسان کے باطن میں زندگی کو تسخیر کرنے کا جذبہ موجود ہے اس کے خواب بھی زندہ ہیں۔ وہ خواب جن حقیقت ہونا ضروری نہیں ہے۔ بات مبالغہ آرائی کی ہو رہی تھی، بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کے عمل کی ہو رہی تھی، اتنا بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی ہو رہی تھی کہ جھوٹ کی حدیں بھی کوسوں پیچھے رہ جائیں، لیکن کیا مبالغہ صرف ہمارے قصیدوں ہی میں تھا؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں تھا ہماری شاعری کی دیگر اصناف کو بھی اس سے مفر نہ تھا۔ یہ اس عہد کی طرز زندگی اور طرز تہذیب کا حصہ تھا۔ خیال کی کمند جتنی بھی دور پھینکی جا سکے پھینکی چاہیے، ورنہ انسان معلوم کے دائروں ہی میں بند ہو کر زندگی گزار دے گا۔ ہمارے شاعر بھی خیال کی کمندوں سے ان گنت نامعلوم خیالات کو معلوم کی وادیوں میں کھینچ لاتے تھے۔ صرف یہی نہیں مبالغہ حسن پیدا کرتا تھا، خیال موثر اور بات آبدار ہو جاتی تھی۔ مبالغہ کی بدولت خیالات کی اقلیم میں رنگارنگ رونقیں آ بستی تھیں۔ مبالغہ آرائی پر محض قصیدہ نگاروں کو معتوب ٹھہرانا انصاف نہیں ہے۔ اس دائرے میں داستان نویس بھی تھے اور خطیب بھی، تقریظ نگار بھی تھے اور تاریخ نویس بھی، قصیدہ نگار بھی تھے اور مرثیہ گو بھی، مثنوی نویس بھی تھے اور ہجو گو بھی۔ قصیدہ نگار شعرا اگر کسی ممدوح کی مدح میں

Scanned by CamScanner

مناظر فطرت کے بیان اور فلسفہ و حکمت کے موضوعات کے اظہار کے حوالے سے مبالغہ کا دامن تھامتے تھے تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔

کسی قوم کے دور عروج کے ممدوح تو کارہائے نمایاں سرانجام دینے کی وجہ سے لائق تحسین ہوتے ہی ہیں، دور زوال کے ممدوحین بھی بے وقوف، نادان یا کم عقل نہیں ہوتے تھے۔ ملکی فتوحات یا توسیع پسندانہ عزائم کی عدم موجودگی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ حکمران اور بادشاہ علم و فضل کی دولت سے محروم ہوتے تھے۔ دور زوال میں بھی (ہندوستانی مسلمان) نوابوں اور امرا کی تربیت کچھ اس طور ہوا کرتی تھی کہ وہ فنون حرب، فنون لطیفہ اور علوم معقولہ و منقولہ سے مہارت کی حد تک آگاہ ہوتے تھے۔ یہ ممدوحین مبالغہ آرائی کو ذاتی انا کی غذا کے طور پر قبول کرنے سے زیادہ اس سے پیدا ہونے والے شعری حسن سے اثر و سرور حاصل کرتے تھے۔ مغربی علوم کے زیر اثر پیدا ہونے والی اردو تنقید میں اگر مشرقی شعری معیارات کا مذاق اڑایا گیا ہے تو یہ اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب میں انگریزی زبان اور اس کے ادب کے فروغ پاتے ہی عربی اور فارسی السنہ کے رسوخ میں کمی واقع ہوئی۔ ان زبانوں میں موجود ادبی اور تہذیبی سرمایے اور معیارات سے ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق قطع ہونے لگا۔ انگریزی ادب کے اثرات کے تحت حالی نے ادبی اصلاحی تحریک کے حوالے سے مشرقی ادبی معیارات میں ترامیم و اضافہ کا علم بلند کیا۔ واقعیت اور حقیقت پسندی پر اس شد و مد سے اصرار ہونے لگا کہ نئے قارئین اپنے علم بیان کی ابجد تک بھول گئے۔ مبالغہ مشرقی شاعری کا موثر حربہ ہے۔ مغرب زدگی کے حوالے سے اس کا مذاق اڑا کسی انسان کو اس کی بہادری کی وجہ سے اگر شیر کہہ کر مخاطب کیا جائے گا تو کیا اسے ہم مبالغہ کہیں گے؟ یہ تو استعاراتی اظہار کا حصہ ہے اسی طرح عرق انفعال یا آنسوؤں کو اگر کوئی شاعر موتی کہہ کر تشبیہی اظہار کے دروازے پر دستک دیتا ہے تو کیا ہم اسے جھوٹ سمجھ کر رد کر دیں گے؟ اگر کوئی شاعر یہ کہہ کر کہ خاک میں دفن ہونے والی حسین صورتیں لالہ و گل کی صورت میں نمایاں ہو گئی ہیں

Scanned by CamScanner

حسن تعلیل کے مسکن کی گھنٹی بجاتا ہے تو کیا ہم اسے توہم پرست یا مجذوب قرار دیں گے؟ ہرگز نہیں انہی امور سے تو شاعری جمال آشنا ہوتی ہے۔ اس کی تاثیر بڑھتی ہے۔ ... میں سائنسی حقائق یا معاشرتی علوم کے بیان سے ہمیں منظوم علوم کا سرمایہ تو مل سکتا ہے لیکن یوں ہمارے جذبات شاعرانہ حسن و تخیل کے ذخائر سے محروم سرد خانوں کی زینت بن جائیں گے۔ البتہ ہم شاعروں سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ضرور ہیں کہ وہ غیر ضروری مبالغہ آرائی سے گریزاں رہیں۔

جدید سائنسی شعور رکھنے والے شعرا کے ہاں بھی محض عریاں خارجی حقائق نظر نہیں آتے۔ وہ تجربہ گاہوں سے حاصل شدہ نتائج کو منظوم نہیں کرتے۔ شاعرانہ وسائل اظہار سے کام لے کر شاعری میں حسن و جمال واثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مبالغہ کو شاعری شریعت میں جائز قرار دینے والے ایک ناگزیر حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔

حوالہ جات

(۱)۔ امیر خسرو اور ان کا عہد، رسالہ لفظ ص ۵۔۶، یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

(۲)۔ امیر خسرو اور ان کا عہد، رسالہ لفظ ص ۱۰

(۳)۔ بلوغ الارب، جلد سوم، محمود شکر آلوسی ص ۶۰۶،۶۰۵ ترجمہ، مرکزی اردو بورڈ لاہور

(۴)۔ احسن القواعد، محمد نجف علی خاں مراد آبادی، ص ۱۹۲) مطبع مجتبائی دہلی

(۵)۔ شعر العجم، جلد پنجم ص ۲۴،

(۶)۔ دائرۃ المعارف اسلامیہ جلد ۱۶/۲ ص ۲۸۶ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

Scanned by CamScanner

لطف اللہ مہندس - تاج محل کا ایک معمار

Ustad Ahmad was a unique and unparalled architect among all the architects of Taj Mehal. Lutfullah Muhandis is, in particular, an important name among his sons. He was a poet also and Muhandis was his pen name. Apart from his Deewan of poetry, he wrote some other books out of which Jamilul Badai, Muntakhib ul Hisab, Risala Khawasul Aadad and Sehr Halal are important. This article deals with his introduction and research papers.

خلاصہ بیگم عرف تاج بی بی، جن کو ممتاز محل کہتے تھے، شاہجہاں کی بیوی، نواب آصف خاں وزیر کی بیٹی، نواب اعتماد الدولہ کے لڑکے کی لڑکی، کی موت دہر آرا نامی لڑکی کی ولادت ے امراض زچگی کے باعث ۱۶۳۰ء میں برہان پور میں ہوئی۔ قبل از مرگ، بیگم نے بادشاہ سے باتوں کا اقرار کرایا تھا:

۱۔ یہ کہ وہ دوسری شادی نہ کریں۔

۲۔ میرے مرقد پر ایسی عمارت تعمیر کرائیں جو دنیا بھر میں لاثانی ہو۔ بہت صاف ستھری اور خوش نما۔

اپنی چہیتی بیوی کی آخری خواہش کے مطابق شاہجہاں نے دور دور سے ماہانہ تنخواہ پر

معماروں کو بلوایا اور پچ کروڑ پچاس لاکھ تیس ہزار روپیہ اس آبادی کی لاگت سے چینی فیروزہ، لاجورد، سونا، سلیمان غوری، الماس، زمرد، عقیق، سنگ گوامیار، سنگ موسیٰ، سنگ سنگ کٹے یاز، سنگ سرخ، سنگ یشب، سنگ گو، وغیرہ قیمتی پتھروں کا ایک خوشنما محل "تاج محل" بنوایا۔ یہ عمارت، دہلی کے کتب خانہ عالیہ کے نسخہ ۲۹۵ کے تحت ۱۰۴۰ھ میں شروع ہوئی تھی اور ۱۰۵۷ھ میں تمام ہوئی۔

"حقیقت چبوترہ عمارت روضہ مقدس مطہرہ حضرت ممتاز الزمانی نواب
تاج محل عہد علیا ارجمند بانو بیگم شروع تیاری عمارت در ۱۰۴۰ھ و در
۱۰۵۷ھ اتمام یافت۔"(۱)

وسنت اسمتھ اور ... کے مطابق تاج محل ۱۶۳۳ء میں تعمیر ہونا شروع ہوا اور اپنی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ ۱۶۵۳ء یعنی ۲۰ سال میں مکمل ہوا۔(۲)

تاج محل کی تعمیر میں جو زمانہ صرف ہوا اس میں مؤرخین کا اختلاف ہے۔

تاج محل کے معماروں میں بہت سے نام ملتے ہیں۔ محمد صالح کنبوہ نے ان میں استاد احمد اور حامد سر معماران نادرہ کا تذکرہ کیا ہے(۳)۔ سر سید احمد خاں نے بھی "آثار الصنادید" میں قلعہ شاہجہاں کی تعمیر کے ذکر میں لکھا ہے کہ:

"استاد احمد اور حامد اپنے فن میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے اور ہندسہ و ہیئت
میں ثانی اقلیدس اور رشک ارشمیدس تھے۔"

تاج محل کے اس نادر العصر معمار احمد کے تین لڑکے تھے۔ عطاء اللہ نادر العصر، لطف اللہ مہندس اور نور اللہ معمار۔

لطف اللہ مہندس کا لقب لطف اللہ اور تخلص مہندس تھا۔ جیسا کہ اس نے خود لکھا ہے:

منکہ ہستم فقیر لطف اللہ

ہم مہندس شہید در افواہ

ما کیاست بجز واں کہا

پدر استاد احمد معمار

سید سلیمان ندوی کے پیش کردہ دیوان لطف اللہ مہندس کی مختصر کیفیت ذیل کے اشعار سے واضح ہے۔ دیوان کی ابتدا نعتیہ قصیدہ سے ہوتی ہے جس کے آخر میں صاحب دیوان اپنا نام، اپنے باپ کا نام اور اپنے مشاغل درس و تدریس کا ذکر کرتا ہے۔

باش لطف اللہ احمد چہ کنی فخر بعلم
خجل ازیں علم تو بہتر کہ نیاید بعمل
عمر در درس بسر بردی و در آخر کار
ہیچ حاصل نشد از مدرسہ جز و بحث و جدل

داراشکوہ کی مدح کرتے ہوئے ایک جگہ اپنے تخلص کے لفظ مہندس سے لطیف استدلال کرتا ہے۔

در حق من گمان خطامی بری خطاست
ہرگز شنیدہ کہ مہندس خطا کند

داراشکوہ کے بیٹے سلیمان شکوہ کی کتخدائی کی تاریخ بھی لکھی ہے۔

گفت جبریل ایں تاریخش
بسلیمان شدہ بلقیس قریں
(۱۰۶۴ھ)

لطف اللہ کا وطن لاہور تھا۔

کے بود آمدن قاصد فرخندہ پیام
مدتے شد کہ ز لاہور نیامد خبرے

حکمت، علم ہندسہ اور منطق میں اپنی قابلیت کا اظہار یوں کرتا ہے:

Scanned by CamScanner

معماروں کو بلوایا اور پھر کروڑوں روپوں کی لاگت سے سنگ مرمر، اور دنیا کے مختلف حصوں سے حاصل کیے گئے جواہرات، سنگ سلیمانی، فیروزہ، [illegible]، سنگ لاجورد، سنگ موسیٰ، سنگ ابری، سنگ کسوٹی، [illegible]، سنگ سرخ، سنگ یشب، سنگ گودا، دیگر قیمتی پتھروں کا ایک خوشنما عالیشان "تاج محل" بنوایا۔ یہ عمارت، اس کے کتبہ تاریخ کے مطابق ۱۶۳۲ء کے قریب ۱۰۴۰ھ میں شروع ہوئی تھی اور ۱۰۵۵ھ میں تمام ہوئی

"حقیقت چہرہ عمارت روضہ مقدس مطہرہ حضرت ممتاز الزمانی نواب تاج محل عہد علیا ارجمند بانو بیگم شروع تیاری عمارت در ۱۰۴۰ھ و در ۱۰۵۵ھ اتمام یافت۔" (۱)

بلسات اسمتھ اور ہیولس کے مطابق تاج محل ۱۶۳۲ء میں تعمیر ہونا شروع ہوا اور اپنی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ ۱۶۵۳ء یعنی ۲۰ سال میں مکمل ہوا۔ (۲)

تاج محل کی تعمیر میں جو زمانہ صرف ہوا اس میں مورخین کا اختلاف ہے۔

تاج محل کے معماروں میں بہت سے نام ملتے ہیں۔ محمد صالح کمبوہ نے ان میں استاد احمد اور حامد سر معماران نادرہ کا تذکرہ کیا ہے (۳)۔ سرسید احمد خاں نے بھی "آثار الصنادید" میں قلعہ شاہجہاں کی تعمیر کے ذکر میں لکھا ہے کہ

"استاد احمد اور حامد اپنے فن میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے اور ہندسہ و ہیئت میں ثانی اقلیدس اور رشک ارشمیدس تھے۔"

تاج محل کے اس نادر العصر معمار احمد کے تین لڑکے تھے۔ عطاء اللہ نادر العصر، لطف اللہ مہندس اور نور اللہ معمار۔

لطف اللہ مہندس کا لقب لطف اللہ اور تخلص مہندس تھا۔ جیسا کہ اس نے خود لکھا ہے

منکہ ہستم فقیر لطف اللہ

ہم مہندس شہید در افواہ

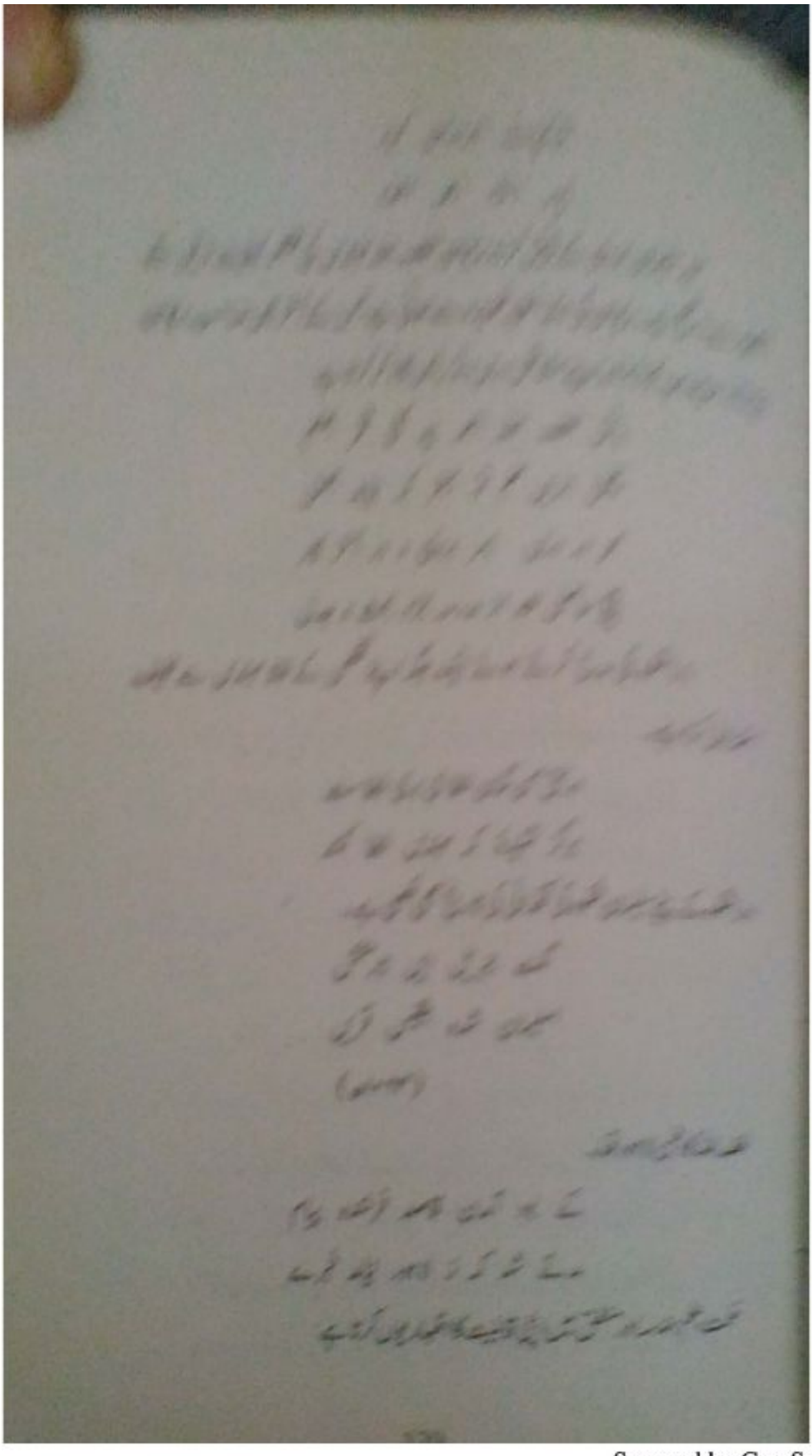

Scanned by CamScanner

بر من ہیچ مداں کشف شد از فیض ازل

راز ہر نکتہ کہ بر ہندسہ داں مشکل بود

صرف در منطق و حکمت شدہ ایں عمر عزیز

لیک آں نکتہ نخواندم کہ ازو حاصل بود

علم ہندسہ کی بدولت ''بحر محیط'' سے آشنائی کا بیان ایک دوسری جگہ یوں لکھا ہے:

از دولت ہندسہ مہندس

با بحر محیط آشنا شد

لطف اللہ مہندس کی مندرجہ ذیل کتابوں کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ جمیع البدائع ۲۔ منتخب الحساب ۳۔ رسالہ خواص اعداد ۴۔ آسمان سخن

۵۔ صور صوفی ۶۔ شرح خلاصۃ الحساب ۷۔ دیوان ۸۔ سحر حلال

''جمیع البدائع'' (۴) وزارت پناہ فضائل دستگاہ شیخ نظام الدین ابن شیخ محمد صالح کی تالیف ''مجموع الصنائع'' سے ماخوذ ہے۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اور دو باب پر مشتمل ہے۔

مقدمہ: تقسیم کلام

باب اول: صنائع لفظی کا بیان

باب دوم: صنائع معنوی کا بیان

رسالہ ''منتخب الحساب'' کے نسخہ (۵) کی ابتدا یوں ہے:

''اما بعد می گوید فقیر لطف اللہ مہندس ابن استاد احمد معمار لاہوری غفر اللہ لہ ولوالدیہ واحسن الیہما والیہ کی کتاب حساب را تصنیف است او محقق و تحریر مدقق شیخ بہاء الدین محمد بن حسن عاملی است رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مشتملت بر قواعد شریفہ و فوائد لطیفہ باشارت خلاصہ دودمان سیادت منتخب خاندان وزارت میر سعید ابن امیر محمد یحییٰ دام اللہ اقبالہ وضاعف اجلالہ

ترجمہ کردم چوں آں نسخہ خلاصہ نام داشت، ایں نسخہ را منتخب ۱۰۹۲ھ نام نہادم تا تاریخ تالیف ایں رسالہ است"

"رسالہ خواص اعداد" (۶) چار مقالوں میں ہے اور اسے لطف اللہ مہندس نے ان چیزوں کے تتبع میں حساب پر لکھا ہے:

"اما بعد می گوید لطف اللہ مہندس متخلص بہ مہندس ابن استاد احمد معمار لاہوری کہ ایں رسالہ ایست کہ علم از شاخہائی خواص اعداد بدان اسعدک اللہ تصنیف پیش از یک باز کند زوج الزوج۔ شیخ الرئیس۔"

مہندس نے "تذکرہ دولت شاہ" کا انتصار "آسمان سخن" کے عنوان سے نظم کیا جسے اسپرنگر نے فہرست مخطوطات اودھ ص ۱۳۲ پر بیان کیا ہے (۷)۔ وہ لکھتا ہے کہ لطف اللہ مہندس ابن احمد نے اس کا نظم میں انتصار کیا۔ اس کے مقدمہ سے جو بارہ اشعار پر مشتمل ہے۔ قاضی کرمانی نے تذکرہ دولت شاہ کو فارسی نظم میں اکبر کے زمانہ میں لکھا تھا اور سات طبقات کے بجائے دس میں کیا تھا۔ مگر لطف اللہ مہندس نے جو اورنگ زیب کا ہمعصر تھا، اس نظم کو شکل جانی دی۔ اس نے دو برج زائد کیے تا کہ تعداد دائرۃ البروج کے نشانات کے ساتھ مناسبت پیدا کرے اور اس وجہ سے اس کا نام آسمان سخن رکھا۔ قریباً دو سو پچاس اشعار میں ہے اور ہر ایک میں شاعر کا نام ہے:

شکر خدائی کہ آسمان سخن
یا فرید محیط نہ آسمان کہن

لیکن اس کا سب سے بڑا کام ۱۰۵۰ھ میں اپنے باپ کے کہنے پر "صور صوفی" مصنفہ عبدالرحمن الصوفی المتوفی ۳۷۶ھ کی کتاب کا، جو ستاروں کے اشکال و صور پر ہے، فارسی ترجمہ ہے۔ اس کا ایک نسخہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں لطف اللہ مہندس کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے۔

Scanned by CamScanner

حوالہ جات وحواشی

۱۔ آغاز تعمیر ۱۰۴۰ھ تو ہم عصر کتب تاریخ میں درج ہے مگر تاریخ اختتام ۱۰۵۷ھ دیگر کتب میں نہیں ہے۔ تاریخ اختتام روضہ کے اندرونی دروازہ پر بڑی محراب کے کتبات آیات قرآنی کے آخر میں درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نسخہ ہذا نے سنی سنائی باتیں نہیں لکھیں بلکہ جو کچھ لکھا ہے خود دیکھ کر اور پیمائش کر کے لکھا ہے۔

۲۔ نسخہ عمل صالح مطبوعہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں تاریخ ۱۰۷۸ھ درج ہے، جو سراسر غلط ہے۔

۳۔ نسخہ برٹش میوزیم ADD-2622

۴۔ "ہمایوں"، جون ۱۹۳۷ء

۵۔ روزنامہ "انقلاب"، ۲۰ اپریل ۱۹۳۲ء

۶۔ برٹش میوزیم، ADD 10-744

۷۔ سالنامہ "کارواں"، ۱۹۳۴ء

Scanned by CamScanner

ڈاکٹر محمد صابر خان

کلامِ غالب میں صنعتِ ادماج

To Ghalib, the function of poetry is not rhyme and metre, but construction of meanings which he terms *"Maani Aafrini"*. This paper focuses on his use of *"Idmaaj"* and *"Mohtamal-uz- Zidden"* i.e. ambivalence, as a poetic device. After defining the meanings of above mentioned literary terms in a traditional- historical perspective, an attempt has been made to sort out verses from *Dewan-e-Ghalib* exemplifying this device. A sample of 37 verses has been analysed to show the multiple layers of meanings in these verses.

غالب کے اولین سوانح نگار، شارح اور نقاد خواجہ حالی نے ''یادگارِ غالب'' کے دوسرے حصے کا عنوان یوں درج کیا ہے ''مرزا کے کلام پر ریویو اور اُس کا انتخاب'' اس بے مثال ''ریویو'' میں کلامِ غالب کی چوتھی خصوصیت کے ذیل میں اس طرح خامہ فرسا ہیں:

> ''۔۔۔ مرزا کی طرزِ ادا میں ایک خاص چیز ہے جو اوروں کے ہاں
> بہت کم دیکھی گئی ہے، اور جن کو مرزا اور دیگر ریختہ گویوں کے کلام میں
> مابہ الامتیاز کہا جا سکتا ہے، اُن کے اکثر اشعار کا بیان ایسا پہلو دار واقع

ہوا ہے کہ ہماری فکر میں اس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں، مگر غور کرنے کے بعد اس میں ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں، جن سے وہ لوگ جو ظاہری معنوں پر قناعت کر لیتے ہیں، لطف نہیں اٹھا سکتے۔۔۔"(۱)

غالب کے اس فنکارانہ رجحان کی وضاحت کرتے ہوئے حالی نے جن دس اشعار کو بطور مثال درج کیا ہے، وہ سب کے سب شعر علم بدیع کے دو صنائع، صنعت "ادماج" اور "محتمل الضدین" کے ذیل میں آتے ہیں۔ یہ گمان کرنا تو مشکل ہے کہ حالی ان صنائع کے اصطلاحی ناموں سے آگاہ نہیں رہے ہوں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب اور ادب کے اثر و نفوذ اور عمل داری کے جس دور کی جبریت ان سے تبصرہ کی بجائے "ریویو" ایسا غریب لفظ لکھواتی ہے، وہی طرز فکر اور روش تقلید، اپنی شعریات میں مروج اصطلاحوں کو مستحکم کرنے کی بجائے، ان کو 'پہلو داری' کے عمومی لفظ سے تعبیر کراتی ہے۔ پہلو داری کا لفظ غالب کے اُن بلند پایہ اشعار کے لئے زیادہ موزوں ہے، جن میں فن غزل کی مخصوص رمزیت کی بدولت معانی کا جہان اتنا وسیع اور بلیغ ہوا ہے کہ ذات کی تن گنائے سے کائنات کی بے کرانی بلکہ ماورائے کائنات کی اسراریت تک کا احاطہ ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس لفظ کا نہایت مناسب استعمال اسلوب احمد انصاری نے اپنے معرکتہ الآراء مضمون "کلام غالب کا ایک رخ" میں کیا ہے، ان کا بیان ہے:۔

"غالب کی شاعری پہلو دار شاعری ہے۔ اس سے میرا اشارہ اُن اشعار کی طرف نہیں، جن کی خوبیاں سب سے پہلے حالی کی ژرف نگاہی نے پہچانیں اور نمایاں کیں، گو ایسے اشعار کو بھی جن میں ایک سے زیادہ مفہوم نکلیں، غالب کی قوتِ گویائی کا اعجاز کہنا چاہئے، اور اس سے کلامِ غالب کے دل نشیں تنوع پر روشنی پڑتی ہے۔۔۔۔ غالب

Scanned by CamScanner

کے یہاں ایسے اشعار کافی تعداد میں ملتے ہیں، جن کی تعبیر، شیکسپیر کی عظیم ڈرامائی شاعری کی طرح، ہم مختلف سطحوں پر کر سکتے ہیں"۔ (۲)

زیر نظر مضمون کا مقصد غالب کا ان دو صنائع سے غیر معمولی شغف اور رغبت کا جائزہ لینا ہے لہٰذا مناسب ہوگا کہ علم بدیع کی مستند کتب کے بیانات کی روشنی میں ان صنائع اور ان سے قریبی مشابہت رکھنے والی صنعتوں کی تعریف و تحدید کر لی جائے۔ صاحب 'بحر الفصاحت' مولوی حکیم محمد نجم الغنی نجمی رامپوری، محتمل الضدین کے باب میں فرماتے ہیں۔

"اس کو صنعت توجیہ بھی کہتے ہیں، یعنی نظم یا نثر مشتمل بر مدح یا ذم وغیرہ کسی قسم کے کلام میں دو وجہ مختلف کا احتمال ہو سکتا ہے اور وہ دونوں جہتیں باہم تضاد کا علاقہ رکھتی ہوں، اور کسی کو ترجیح نہ ہو، اور برائی اور بھلائی ان کی یعنی مناسبت اور نامناسبت مقام ہونا کسی قرینے سے معلوم ہو سکے اور بعض جگہ قرینہ بھی گم ہو جائے اور سامعین کو دو معنی بر سبیل اختلاف کے دریافت ہوں۔۔۔" (۳)

مثالوں کے ذیل میں غالب کے دو شعر بھی درج کیے ہیں، دشت کو دیکھ کر گھر یاد آنے والا اور سر اڑانے کے وعدے کو مکرر چاہنے والا۔ صنعت ہجو ملیح کو محتمل الضدین کے قبیل سے قرار دیتے ہیں تاہم فرق یہ کہ ثانی الذکر عام ہے خواہ مدح و ہجو پیدا ہو یا نہ ہو، بلکہ مضمون باہم تضاد رکھتے ہوں، 'صنعت ادماج' کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"۔۔۔ یعنی کلام سے دو معنی حاصل ہوں اور تصریح دوسرے معنی کی نہ کی ہو، یہ بہ نسبت استتباع کے عام ہے یعنی استتباع سے تو یہ مراد ہے کہ ایک مدح سے دوسری مدح پیدا ہو اور ادماج میں مدح کا ہونا کچھ ضرور نہیں۔ اور ایہام و ادماج میں یہ فرق رہا کہ ایہام میں ایک لفظ دو معنی رکھتا ہے۔۔۔ اور ادماج میں پورے کلام کے دو معنی ہوتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

اور توجیہ یعنی محتمل الضدین اور ادماج میں بھی فرق ہے یعنی دو پہلو سے ادماج کے خاص ہے، اس لئے کہ اس میں ایک کلام سے ایک پہلو دو معنی پیدا ہوتے ہیں کہ دوسرے معنی پہلے معنی کی ضد ہوتے ہیں ... اور ادماج میں ایک معنی دوسرے معنی کی ضد نہیں ہوتے"۔ (۴)

ادماج کی وضاحت میں غالب کے چار شعر درج کر کے ان کی وضاحت کی ہے۔ 'تسہیل البلاغت' کے مصنف محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی کے مطابق

"ادماج، لغوی معنی لپیٹنا، اصطلاح میں ایک مدعا سے دوسرا مدعا ضمناً پیدا ہونا، ایک کلام سے دو معنی حاصل ہونا"۔ (۵)

سجاد بیگ کی تعریف بھی مختصر اور غیر واضح ہے اور جو ایک شعر بطور مثال انہوں نے درج کیا، اس سے بھی اس صنعت کی وضاحت نہیں ہوتی۔ بلکہ شاید یہ مثال غلط ہے۔ شعر یہ ہے۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

"اول غفلت کی شکایت ہے اور پھر جفا کی"

غالب کا اس مضمون کا شعر بدرجہا بہتر ہے گو یہ بھی ادماج کی مثال نہیں۔

گو سمجھتا نہیں پر حسن تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سرگرم جفا ہوتا ہے

محتمل الضدین کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"توجیہ یا محتمل الضدین۔ کلام ایک ہی ہو لیکن مدح و ذم دونوں پہلو اس سے نکل سکتے ہوں

کیا ہی تاثیر ہے واللہ تری صحبت کو
یک بیک لحظہ میں ہو جاتا ہے احمق دانا

Scanned by CamScanner

احتمل عقل ضد ہو جاتا ہے یا عقل ضد احتمل ہو جاتا ہے۔
دونوں معنی نکل سکتے ہیں۔"(۶)

مذکورہ مثال کو اس صنعت کی وضاحت کے لیے درست تو ہے، لیکن اگر غالب جیسے شعرا کے کلام سے اس قسم کی صنائع کی مثالیں تلاش کی جائیں تو نہ صرف یہ کہ بجز احتمالات ممکن تھی بلکہ خود ان صنائع کا اعتبار بھی مثبت انداز میں قائم ہوتا، جیسا کہ اس مضمون میں آگے چل کر واضح ہوگا۔

"معیار البلاغت" کے مصنف منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی، یوں رقمطراز ہیں:

"ادماج جس کو ذوالمعنیین بھی کہتے ہیں، ایسا کلام ہے کہ اس سے دو معنی حاصل ہوں، جیسے

مشکل بہت ہے گردش ہی ہم کو سارے دن
جو تم پھر آؤ تو پیارے پھریں ہمارے دن

لفظ پھر آؤ دو معنی رکھتا ہے"۔(۷)

اس شعر کے علاوہ سحر نے امانت، مروت، قرار اور جسم کے اشعار کی جو مثالیں دی ہیں، ان پر ادماج سے زیادہ ایہام کا اطلاق ہو سکتا ہے کیوں کہ ان میں پورے شعر کے متن کی بجائے ذو معنویت کا مدار کسی ایک لفظ پر ہے۔ توجیہ کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"توجیہ کہ جس کو ذوالوجہین اور محتمل الضدین بھی کہتے ہیں وہ ہے کہ کلام دو صورت مختلف پر دلالت کرے، جیسے جور اور مدح، علیٰ ہذا القیاس"۔(۸)

چونکہ 'مفتاح البلاغت' کے مولف نے ہر دو صنائع کی تعریف معناً ہی نہیں لفظاً بھی 'بحر الفصاحت' سے لی ہے، لہٰذا اس کا الگ سے ذکر ضروری نہیں۔

'محاسن الفاظ غالب' کے مصنف نذیر احمد محتمل الضدین کے بارے میں لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

''کلام میں ایسے الفاظ لانا جن کے معانی میں دو وجہ مختلف کا احتمال ہو اور وہ دونوں وجہیں باہم تضاد کا علاقہ رکھتی ہوں اور اس وجہ سے کلام کے دو معنی لیے جا سکتے ہوں۔'' (۹)

مصنف نے غالب کے جو پانچ شعر اس صنعت کی مثال کے طور پر درج کیے ہیں، ان میں صرف ایک شعر ایسا ہے جو واضح طور پر متضاد معنی کا حامل ہے ع سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا، باقی اشعار کو ادماج کے زمرے میں رکھنا زیادہ بہتر ہوگا جبکہ درج ذیل شعر ان دونوں میں سے کسی بھی صنعت کے ذیل میں شمار کرنا، زبردستی ہی قرار پائے گا ۔

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

صاحبِ ادماج کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''یعنی کلام سے دو معنی حاصل ہوں، ایہام میں ایک لفظ دو معنی رکھتا ہے۔۔۔۔ اور ادماج میں پورے کلام کے دو معنی ہوتے ہیں۔ محتمل الضدین اور ادماج میں یہ فرق ہے کہ محتمل الضدین میں پورے کلام کے جو دو معنی ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے سے تضاد کا علاقہ رکھتے ہیں، ادماج میں دونوں معنی مختلف ضرور ہوتے ہیں مگر ایک دوسرے کے متضاد نہیں ہوتے۔'' (۱۰)

ابو الفیض سحر اپنے مضمون مشمولہ 'درسِ بلاغت' میں ادماج کو صنائع معنوی میں سب سے پہلے درج کر کے اس کی نہایت واضح تعریف کرتے ہیں:۔

''شعر میں ایسے الفاظ اور ایسی تراکیب کا استعمال کرنا جن سے مجموعی طور پر دو معنی یا دو مفہوم پیدا ہوتے ہوں۔ مگر کوئی خاص معنی یا مفہوم حتمی طور پر واضح نہ ہوتا ہو۔ استتباع بھی اسی قبیل کی صنعت ہے مگر

Scanned by CamScanner

فرق یہ ہے کہ استطراد مدح کے لیے مخصوص ہے جبکہ ادماج کا مدعا سے تعلق ضروری نہیں۔ ادماج اور ایہام میں بھی فرق ہے۔ وہ یہ کہ ایہام میں لفظ ایک یا دو معنی کا حامل ہوتا ہے اور قاری ایک دلچسپ شک یا وہم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ آیا شاعر کی مراد اس موقع پر اس معنی سے تھی یا اس معنی سے۔ اور یہ تکنیک ہی شعر کی تفہیم میں لطف پیدا کرتی ہے۔ اس کے برخلاف ادماج کی صورت قدرے مختلف ہے۔ یہاں شک یا وہم لفظ کے معنی میں نہیں رہتا۔ بلکہ اگر کسی لفظ یا ترکیب کے دو معنی یا دو مفاہیم نکلتے ہیں اور وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ درست، صاف اور واضح ہوتے ہیں، قاری کو اختیار ہے کہ وہ کسی ایک معنی یا مفہوم کو قبول کر لے اور دوسرے کو رد کر دے اور اس فیصلے کی صحت قاری کے فہم و ادراک کے نہج اور معیار پر منحصر ہوتی ہے۔ ادماج کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک مدعا سے دوسرا مدعا پیدا ہو جاتا ہے، یعنی ادماج کا خاصہ کثیر المعنویت ہے، یہی وجہ ہے کہ غالب میں ادماج کی مثالیں عام ہیں"۔ (۱۱)

مذکورہ تعریف میں اس قدر اصلاح ضروری ہے کہ ادماج میں ذومعنویت یا کثیر المعنویت کا مدار کسی ایک لفظ یا ترکیب کی بجائے، شعر کے پورے متن پر ہوتا ہے۔ بظاہر کوئی لفظ یا ترکیب ذومعنویت کی حامل دکھائی دے تو بھی یہ دوہرا مفہوم شعر کے تمام الفاظ یعنی مجموعی متن سے ہی قائم ہوتے ہیں، تب ہی یہ صنعت ایہام سے ممیز کی جا سکتی ہے۔ اپنے بیان کی وضاحت کے لیے مصنف نے غالب کے ہی اشعار کی تین مثالیں درج کی ہیں، اور یہ تینوں درست ہیں۔

حالی کی یادگار کے بعد تاریخی اعتبار سے دوسری اہم تحریر عبدالرحمٰن بجنوری کا

Scanned by CamScanner

وہ مقالہ ہے جو انھوں نے 'دیوانِ غالب جدید' ــــــــ المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ کے مقدمے کے طور پر
لکھا تھا، لیکن اُن کی وفات کے بعد مفتی انوار الحق نے مرتب اور شائع کیا۔ تاہم یہ مقالہ
دیوان کے مقدمے کے طور پر شامل ہوا اور بعد ازاں 'محاسنِ کلامِ غالب' کے عنوان سے شائع
ہوتا رہا۔ تاثراتی تنقید کے اس شہکار مضمون کے مصنف کا ذہن بھی اپنے دور کی اس مقصدیت
اور جبریت کا اسیر ہے، جس کے زیرِ اثر صنائع بدائع کو (مغربی شعر و ادب سے بھی اثرات
قبول کرنے کے سبب) شعر کے لئے نہ صرف بے کار و بے فائدہ سمجھا گیا تھا اور کسی بڑے
شاعر کے یہاں ان کی موجودگی کو تسلیم کرنے سے نہ صرف انکار کیا جاتا تھا بلکہ نہایت بلند سطح
سے ان محاسنِ شعر کو مردود و مطعون کیا جاتا تھا۔ بجنوری کے خیالات اس حوالے سے واضح
ہوں:۔

"جس طرح اقلیدس کے خطوط سے خوبصورت سراپا نہیں بن سکتا۔ صنائع اور بدائع سے خوب کلام ترتیب نہیں پا سکتا۔ قابلِ عزت ہیں وہ تمام فضلا جنہوں نے علم صنائع اور بدائع کو فروغ دیا ہے، لیکن اگر ان کی تمام کتابیں جلا دی جائیں تو شعر کا ذرا بھی نقصان نہیں۔ صنائع بدائع کے استعمال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ طبیعت میں آمد نہیں ہے۔ صنائع اور بدائع کا استعمال کلام کو عام ادبی زندگی سے جدا کر دیتا ہے اور جس زمانے میں صنائع اور بدائع کا عام رواج ہو وہ زمانہ اقوام کے انحطاط اور زوال کا ہوتا ہے۔ غالب بہت کم صنائع اور بدائع کا استعمال کرتے ہیں"۔ (۱۲)

صنائع کے تمام تر استرداد اور انکار کے باوجود وہ حالی کے ہم نوا بن کر اقرار کرتے ہیں

"لیکن ایک خصوصیت اُن کے کلام میں ایسی ہے جس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں موجود نہیں ہے، جس طرح سفید رنگ میں

قوم اکثر کی زبان میں معاصر ہیں، ان کے بعض اشعار کی سادگی بھی ہے اور یہ لطیفہ بھی یہاں ہیں۔ اسی طرح کلام سے اس کے ... مولانا حالی نے مرزا غالب کے کلام میں اس کی ایک دو مثالیں ... اور حقیقت میں مولانا حالی مرزا غالب سے یہ کلام نقل کرتے ہیں"۔ (۱۲)

اس کے بعد بخاری مرحوم حالی کے حوالے کر دو اس میں سے چند اشعار درج کر کے معلوم کی دو معلومات پر حاشیہ آرائی کرتے ہیں۔ لیکن ان کے عہد کی خصوصی روایت انہیں بھی اس عجیب و غریب خصوصیت 'ابہام' کا نام دینے کی اجازت نہیں دیتی۔

پاکستان میں جہاں صنعتِ ایہام پر واحد کامل ذکر کام سید عابد علی عابد کی 'البیان' اور 'البدیع' ہیں۔ وہ صنعتِ ایہام کو کامل ذکر ہی شمار نہیں کرتے صرف ایک جملہ 'البدیع' میں اس عنوان سے درج ہے۔

"یہ بھی عصرِ حاضر کے مذاق کے مطابق نہ ہوگی اور ... اہم نہیں"۔ (۱۳)

ان کتب میں اور بے شمار مقامات کی طرح یہاں بھی سید صاحب سے فروگذاشت ہوئی ہے۔ جبکہ ان کی ماخذ کتب میں ایہام کی تعریف اور مثالیں ملتی ہیں۔ اصل میں ہوا یہ کہ انہوں نے ایہام اور محتمل الضدین میں امتیاز روا نہ رکھا اور وہ تمام مثالیں جو انہیں ایہام کے حوالے سے بیان کرنا چاہیے تھیں۔ وہ انہیں محتمل الضدین کے تحت درج کر کے خوب خوب شرح کرتے ہیں، لکھتے ہیں

"صنعت محتمل الضدین یا صنعت توجیہ: کسی قسم کے کلام میں دو وجوہ مختلف کا احتمال ہو سکتا ہے اور دونوں جہتیں باہم تضاد کا علاقہ رکھتی ہوں اور کسی کو ترجیح نہ ہو اور بُرائی اور بھلائی اُن کی یعنی مناسبت اور نامناسبت مقام ہونا کسی قرینے سے معلوم ہو سکے، اور بعض جگہ قرینہ بھی گم ہو جائے اور سامعین کو دو معنی بر سبیل اختلاف کے دریافت ہوں۔"

Scanned by CamScanner

مذکورہ عبارت نہ صرف 'بحر الفصاحت' کی عبارت سے ماخوذ ہے بلکہ الفاظ بھی وہی ہیں۔ اس مضمون کے آغاز میں مجمل الفصاحت کے حوالے سے، بحر الفصاحت کی تعریف درج کی گئی ہے، موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ سید صاحب کو یہاں استفادے کا اعتراف کر کے حوالہ درج کرنا چاہیے تھا۔ پھر یہ کہ غالب کے جس قدر اشعار اس صنعت کے حوالے سے بیان ہوئے ان میں زیادہ ایسے ہیں جن کے دو معنی میں تضاد کا علاقہ نہیں، لہٰذا انہیں ایہام کے باب میں رکھنا چاہیے تھا۔

اب تک کی بحث سے ثابت ہو چکا کہ جہانِ معنی کی وسعت کا ذریعہ بننے والی اس صنعت سے غالب کو غیر معمولی دلچسپی رہی ہے۔ لہٰذا دیوانِ غالب کی ایک خواندگی کے بعد جو کچھ سامنے آیا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا (۱۸۲۱ء)

اس شعر کے دوسرے مصرع کو سادہ بیانیہ مان کر پڑھیں تو مراد ہوگی کہ کارزارِ عشق میں قیس کے علاوہ کوئی شخص ناموری نہ پا سکا لہٰذا قرار پایا کہ صحرا کی وسعت حاسد کی آنکھ کی طرح تنگ تھی۔ دوسرے معنی مصرعِ ثانی کو استفہامیہ انداز میں پڑھنے سے پیدا ہوں گے جن میں قیس کے تنہا مردِ میدانِ عشق ہونے کو چیلنج کیا جائے گا کہ اگر ہم یہ بات مان لیں کہ دنیائے عشق کا واحد سورما صرف اور صرف قیس تھا تو پھر یہ بھی مان لینا چاہیے کہ صحرا کوئی وسیع و عریض مظہرِ کائنات نہیں بلکہ حاسد کی آنکھ تھا جس سے تنگ کسی شے کا تصور ممکن نہیں۔ چونکہ دوسری بات درست نہیں۔ اس لئے پہلی بات کے بارے میں عامۃ الناس کی رائے بھی درست نہیں۔

اس غزل کا دوسرا شعر ہے۔

۲۔ آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا (۱۸۲۱ء)

Scanned by CamScanner

شارحین نے 'درست کردن' کو قائم کرنا، بنانا، بھر بنانا وغیرہ کے معنی میں بھی لیا اور صاف کرنا مٹانا، دور کرنا کے معنی میں بھی اور یوں شعر کے دو مفہوم قائم کئے۔ تاہم راقم کے خیال میں شعر کا درست مفہوم یہی ہے کہ دیوانگی کے عالم میں الجھنے والا دامن نقش سودا کو قائم کرنے اور بنانے کا باعث ہوا ہے۔

۳۔ منہ نہ کھلنے پر وہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا (۱۸۵۲ء)

مصرع اول میں 'دیکھا ہی نہیں' کو استعجابیہ لہجے میں پڑھیں تو چہرۂ محبوب کی تحسین کا پہلو ہے اور نقاب کے اندر چھپ جانے کے حوالے سے دیکھیں تو بھی درست۔

۴۔ کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غم روزگار تھا (۱۸۲۱ء)

۱۔ ناتجربہ کاری کے عالم میں ہم عشق کے غم کو بھی کم سمجھا کرتے تھے، اب بعد از تجربہ معلوم ہوا کہ ایسا نہیں بلکہ کم ہونے پر بھی یہ دنیا بھر کے غموں کے برابر ہے۔

۲۔ کبھی ہم بھی عشق کے غم کو کوئی بڑی چیز نہیں سمجھتے تھے، اب تجربے کے بعد معلوم ہوا کہ اگر عشق کا غم کم ہو جائے تو اس کی جگہ دنیا کے غم لے لیتے ہیں۔ اس شعر کو ادماج کی مثال شمار کرنا چاہیے۔

۵۔ دل ہر قطرہ ہے ساز 'انا البحر'
ہم اُس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا (بعد از ۱۸۲۶ء)

'ہمارا پوچھنا کیا' استفہام اور استعجاب ہر دو طرح سے بامعنی ہے۔ یعنی ہماری اصل اور ہماری حقیقت کے بارے میں بس کچھ نہ پوچھو کہ ہم اُسی کے ہیں اور اُسی سے ہیں، اور دوسرے یہ انداز تحسین و ستائش کہ ہمارا مقام بہت بلند، بہت ارفع، بہت اعلیٰ ہے۔ یہ ادماج ہے۔

Scanned by CamScanner

۹۔ کس سے غارت گر جنس وفا سن
شکست قیمت دل کی صدا کیا

دوسرے مصرع کا استفہام انکاری بھی ہے اور استعجابی بھی۔ محبوب (غارت گر) سے سن کر دل ٹوٹنے سے کس طرح کی صدا برآمد ہوتی ہے، اور یہ کہ بھلا دل کے ٹوٹنے کی بھی کوئی آواز ہوتی ہے کیا؟ یعنی کوئی نہیں ہوتی۔ یہاں محتمل الضدین کا احتمال زیادہ ہے۔

۱۰۔ کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا (۱۸۵۲ء)

حالی کی طبع دین دار و احتیاط پسند نے اس شعر کے معنی یوں متعین کیے ہیں۔

"کہتا ہے کہ میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھ کو سوا نقصان کے کچھ فائدہ نہ پہنچا۔ یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں ہے بلکہ عبودیت ہے۔ بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے"۔ (۱۵)

'وہ' کا اشارہ خدائی کی طرف سمجھا جائے تو معانی بیان کرنے سے قبل نعوذ باللہ پڑھنا واجب ہوگا کہ بندگی کے باوصف بھلا نہ ہونے سے گمان گزرتا ہے کہ کہیں ہم نے نمرود کی (جھوٹی) خدائی میں تو زیست بسر نہیں کی! یہ معنی غالب کی افتادِ طبع اور شاعرانہ فکر کے زیادہ قریب ہیں۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے (۱۸۳۵ء)

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت
مے تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

غلام رسول مہر نے ایک تیسرے معنی بھی دریافت کیے ہیں۔

Scanned by CamScanner

"پہلے مصرع کے آخر میں استفہام کے بجائے استعجاب کی علامت بھی جائے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ مجھے تو بندگی کا حق ادا کرتے رہنے سے بھی کوئی فائدہ نہ پہنچا، لیکن نمرود کی طرف دیکھیے تو اس نے خدائی کا دعویٰ کیا اور بڑے رعب داب اور شان و شوکت کے ساتھ سلطنت کرتا رہا"۔ (۱۶)

۸۔ نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا (بعد از ۱۸۴۷ء)

ہستی کو ہستی پر ترجیح دینا غالب کا مرغوب ترین مضمون ہے۔ لیکن اس موضوع کے تمام اشعار میں یہ سب سے دلکش ہے۔ ادماج کی مثال اس طرح ہے کہ 'نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا' کے فوری معنی جو ذہن میں آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ میرے نہ ہونے سے آخر کیا فرق پڑتا تھا! اچھا ہی تھا اگر نہ ہوتا! اور دوسرے معنی یہ کہ دیکھنا اور سوچنا چاہئے کہ نہ ہونے کی صورت میں، میں کیا ہوتا؟ ظاہر ہے کہ وہی ہوتا جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا!

۹۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا (۱۸۲۱ء)

اس شعر کو کم و بیش سبھی علمائے علم بدیع نے صنعتِ ادماج کی مثال کے طور پر درج کیا ہے لیکن یہ دریافت ابتداً حالی کی ہے لہٰذا انہی کی زبانی سنیے!

"اس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے، یعنی خوف معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذرا غور کرنے کے بعد اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی، مگر دشت بھی اس قدر ویران ہے کہ اسکو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے"۔ (۱۷)

Scanned by CamScanner

۱۰۔ یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی

گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا (بعد از [illegible])

شاعر یہاں سے محبوب کے بگڑ بیٹھنے کی دو مختلف اور متضاد وجوہ بیان کر کے اس شعر کو مکمل المعانی کا امکان دکھا اور دکھایا ہے۔ پہلی وجہ یہ کہ محبوب اس مشابہت کو اپنی توہین خیال کرتا اور کہتا ہے کہ کہاں یوسف ایسا حسین اور پیغمبر اور کہاں مجھ سے جیسا ایک عام انسان۔ دوسری وجہ بگڑنے کی یہ کہ بھرا تقابل کسی اور انسان سے خواہ وہ یوسف ہی ہو، کیوں کیا جائے۔ تاہم محبوب اگر وہی ہے جو خود کو اوروں سے بھی بہتر خیال کرتا ہے تو یہ دوسرے معنی ہی زیادہ درست ہوں گے۔

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں

کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

۱۱۔ کوہکن نقاش یک تمثالِ شیریں تھا اسد

سنگ سے سر مار کر پیدا نہ ہووے آشنا (۱۸۲۱ء)

دوسرے مصرع میں استفہام انکاری اور اثباتی دونوں کا امکان ہے۔ پہلے مفہوم کے مطابق معنی ہوں گے، کہ فرہاد محض مجسمہ تراش تھا، ورنہ بھلا کہیں پتھروں سے سر ٹکرانے سے بھی محبوب ملتے ہیں! دوسرے مفہوم کے مطابق فرہاد شیریں کا مجسمہ ساز محض تھا ورنہ یہ کیسے ممکن کہ پتھر سے سر ٹکرا کر جان دے دی جائے اور محبوب حاصل نہ ہو سکے!

۱۲۔ ہے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب

آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا (۱۸۴۷ء)

مصرع اول کی دو تعبیریں ممکن ہیں، اول یہ کہ محبوب نے غیر کی بزم میں بہت شراب پی اور یوں عاشقِ صادق کو آزمایا، دوسرے یہ کہ بزمِ غیر میں شراب نہ پی اور عاشق کا امتحان لینے کے لیے اُس کے گھر آ کر خوب پی اور یوں اُسے معرضِ امتحان میں ڈال دیا۔

Scanned by CamScanner

۱۳۔ لکھتا ہوں اسد سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت (۱۸۱۶ء)

اس شعر میں مصرع اولیٰ اس امکان کا جواز فراہم کرتا ہے کہ دوسرے مصرع کے محاورے حرف پر انگلی رکھنا (یا اٹھانا) کو لغوی سطح پر بھی درست سمجھا جا سکتا ہے کہ گرم شے کو ہاتھ لگانا آسان نہیں ہوتا، دوسرے معنی محاورے کو مان کر یہ کہ کوئی میرے الفاظ پر اعتراض نہ کر سکے۔ یہ استعارۂ معکوس کا حربہ ہے جو اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب محاورے کو اس انداز میں برتا اور باندھا جائے کہ اُس کے لغوی اور محاوراتی دونوں معنی کارآمد ہو جائیں۔

۱۴۔ نہیں گر سرو برگ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت (بعد از ۱۸۲۱ء)

۱۔ کائنات کی حقیقت یا مظاہر کے باطن تک اگر آپ کی رسائی ممکن نہیں، نہ سہی آپ مادی دنیا کی خوبصورت اشیا سے لطف اندوز ہو لیں، اور اسی پر قناعت کر لیں۔

۲۔ اگر آپ اشیاء اور ظواہر کے باطنی معنی سے آگاہی کا سروسامان نہیں رکھتے تو تماشائے کائنات کی نیرنگی سے دل لگا کر اس ذریعے سے کائنات کے باطن کی معرفت حاصل کر لیں۔

اس شعر پر بحث کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی فرماتے ہیں:۔

''زیرِ بحث شعر کے دو مفاہیم بیک وقت بیان کیے گئے ہیں۔۔۔۔
غالب کے یہاں تماشا صوفیانہ اصطلاح بھی ہے اور اُن کی اپنی شاعرانہ اصطلاح بھی۔۔۔ موجودہ شعر میں 'تماشا' مادی دنیا کی خوبصورت اشیا کی علامت ہے۔۔۔ ظاہری مظاہر کم دلکش نہیں ہیں بلکہ وہ فریب ہوتے ہوئے بھی 'تماشا' (بمعنی عرفان) کا حکم رکھتے ہیں، ان مظاہر کا فریب یہی ہے کہ وہ فریب ہوتے ہوئے بھی حقیقت

Scanned by CamScanner

معلوم ہوتے ہیں۔۔۔ اس طرح یہ شعر یک وقت کائنات باطن کا
اقرار، اس کے مشکل الحصول ہونے پر دلالت اور مادی مظاہر کی
وقعت اور Validity پر اصرار کرتا ہے"۔ (۱۸)

۱۵۔ کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی میں صلا میرے بعد (۱۸۲۱ء)

خود غالب نے مصرع اول کے بارے میں بتایا تھا کہ خود یہ صدائے ساقی کے الفاظ بھی ہیں۔ تاہم اس شعر میں 'دوسرے لطیف معنی' کا سہرا بھی حالی کے سر بندھتا ہے۔

۱۔ میری موت کے بعد ساقی بار بار دعوت دے رہا ہے کہ عشق کی مرد افگن شراب کا شوق رکھنے والا کوئی ہے، تو آئے! پہلے دعوت دینے اور بلانے کے انداز میں۔

۲۔ جب کوئی نہیں آتا تو ساقی مصرع اول کو متاسفانہ لہجے میں استفہام انکاری کے معنی میں دہراتا ہے کہ شراب عشق کا پینے والا اب (بعد از وفات متکلم) کوئی نہیں ہے۔

غالب کے کلام میں ایسے اشعار کی تعداد کافی ہے جن میں لہجے کی تبدیلی سے معنی کی سطح بدل جاتی ہے، تاہم یہ شعر بقول میرؔ "اس اعتبار سے بالکل یگانہ نظر آتا ہے"

۱۶۔ کیوں کہ اُس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز (۱۸۲۶ء)

صنعت ادماج کے حوالے سے اس شعر کو بھی نے درج کیا ہے۔

۱۔ میں اُس بُت سے اپنی جان کیوں چراؤں؟ اُس پر اپنی جان کیوں نہ قربان کر دوں کہ اُس پر جان وارنا عین تقاضائے ایمان ہے۔

۲۔ میں اُس بت سے جان بچا کر نہیں رکھتا، اگر ایسا کروں گا تو وہ مجھ سے میرا ایمان چھین لے گا اور ایمان مجھے جان سے بڑھ کر عزیز ہے۔

۱۷۔ مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور

Scanned by CamScanner

رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم (۱۸۳۳ء)

۱۔ خدا کا شکر ہے کہ اُس نے وطن سے باہر، عالم غربت میں موت دی۔ اگر وطن میں مرتے تو اہل وطن پر بے بسی اور کس مپرسی کھل جاتی۔ کفن دفن کا انتظام نہ ہو سکنے سے لے کر تعزیت کرنے اور نماز جنازہ پڑھنے بلکہ نہ پڑھنے والوں کی تعداد اور نے چراغے، نے گلے کی حالت والے مزار سے مرنے والا کا بھرم کھل جانے کا خطرہ بہر حال ہوتا ہے۔ ایک اور جگہ یہ مضمون یوں باندھا ہے۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا (بعد از ۱۸۴۷ء)

۲۔ دوسرا مفہوم قدرے تکلف سے برامد ہوتا ہے وہ یہ کہ غربت و بے وطنی کی موت سے بڑھ کر بے چارگی اور بے کسی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، متکلم شکر گزار ہے (طنزاً ہی سہی) کہ خداوند عز و جل نے دیارِ غیر میں موت سے نواز کر میری بے کسی کی تکمیل کر دی، شرم رکھ لی۔ بصورت دیگر بے کسی کامل و اکمل صورت حاصل کرنے سے محروم رہتی۔

۱۸۔ آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں (۱۸۴۷ء)

۱۔ ہم نے تہیہ تو کر لیا ہے کہ آج محبوب کے پاس جا کر اپنی پریشاں حالی بیان کریں گے، لیکن پتہ نہیں اُس کی بارگاہ میں، اُس کے رعبِ حسن کے حضور، کچھ کہا بھی جا سکے گا یا نہیں۔

۲۔ ہم اپنی پریشانی کا احوال سنانے جا تو رہے ہیں، لیکن معلوم نہیں محبوب سن کر کیا کہے گا، ہمارا حالِ دل اُس پر اثر انداز ہو گا بھی یا نہیں! اس غزل کے مطلع کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا، ورنہ وہاں بھی ایک دوسرے لطیف معنی کا احتمال موجود ہے۔

۱۹۔ کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

Scanned by CamScanner

۱۔ محبوب نے دشمنی وفا کرنا شروع کی اور مجھ سے اس کو [illegible]
سے تعبیر کیا۔ لہٰذا عاشق محبوب کو تسلی دے رہا ہے کہ تو نہ گھبرا دشمن وفا تو [illegible]
زوال کرتے آئے ہیں!

۲۔ محبوب کا رویہ جفا کا ہی ہے اور اہل دنیا کا گمان غلط نہیں کہ محبوب [illegible]
مرتکب ہو رہا ہے، لیکن عاشق چونکہ صادق ہے اس لئے وہ محبوب کی جفا کو بھی [illegible]
دیتا ہے۔

۲۰۔ دل میں آ جائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

۱۔ نالہ بلند کرنے کے بعد بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے اور جیسے ہی بے ہوشی دور
ہوتی ہے، محبوب کا تصور دل میں آ موجود ہوتا ہے۔ بھلا بتلایئے اسے نالے کی رسائی نہ
قرار دیں!

۲۔ بے ہوشی سے فراغت پاتے ہی نالہ وفریاد پھر دل میں آ جاتے ہیں۔ یعنی
نالے کی رسائی نہیں ہے۔ دونوں معنی میں ہجو ملیح کا سا انداز ہے مگر کمال درجے کے [illegible]
بھولپن کے ساتھ!

۲۱۔ ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے خدا نکردہ تجھے بے وفا کہوں (۱۸۱۲ء)

۱۔ اس شعر کے معنی بالعموم یہی مراد لیے جاتے ہیں کہ میرا گمان پہلے ہی تجھے بے
وفا قرار دے رہا ہے، تو اپنا طرزِ عمل بدل، ظلم نہ کر، تا کہ میں اپنے گمان کے رو برو تو شرمندہ
ہوں!

۲۔ ایک اور معنی بھی اس شعر سے متبادر ہوتے ہیں اور وہ یہ کہ اے محبوب تیرے
ظلم کے سبب میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ تو بے وفا ہے۔ لیکن یہ محض گمان کی حد تک

Scanned by CamScanner

پہلے فوری طور پر جھٹک دیا گیا، خدا نہ کرے کہ میں مجھے بھی اپنی زبان سے بے وفا کہوں۔ یہی مضمون ایک اور شعر میں بھی بیان ہوا ہے

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے (۱۸۲۱ء)

۲۲۔ پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں (۱۸۴۷ء)

۱۔ ظاہر ہے فرشتے اور انسان کی زبان ایک تو ہو نہیں سکتی اس پر بھی جبریل میرے کلام کی داد دیتا ہے۔

۲۔ اگرچہ جبریل کی زبان میری زبان کے ایسی فصیح و بلیغ نہیں، اور وہ میرے کلام کے پورے معنی بھی نہیں سمجھ سکتا، لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ داد اسی سے ملتی، اہلِ زمانہ سے وہ بھی میسر نہیں ہوتی۔

۲۳۔ ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں (۱۸۴۷ء)

اس شعر کو حالی نے 'پہلوداری' کے حوالے سے درج کیا ہے۔ ہمارے خیال میں 'فرشتہ' کی تعمیم اتنی کنایاتی بھی نہیں کہ اس شعر کے انکارِ ابلیس کے علاوہ کوئی اور معنی ذہن میں پہلے آئیں۔ وہ لکھتے ہیں

''اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ معشوق کو یا تو ہماری خاطر ایسی عزیز تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری نسبت کوئی گستاخی کرتا تو اس کو گوارا نہ ہوتی، اور یا اب ہم کو بالکل نظر سے گرا دیا گیا ہے۔ اور دوسرے عمدہ معنی یہ ہیں کہ اس شعر میں آدم اور فرشتوں کے اس قصے کی طرف اشارہ ہے جو قرآن مجید میں مذکورہ ہے۔۔۔'' (۱۹)

Scanned by CamScanner

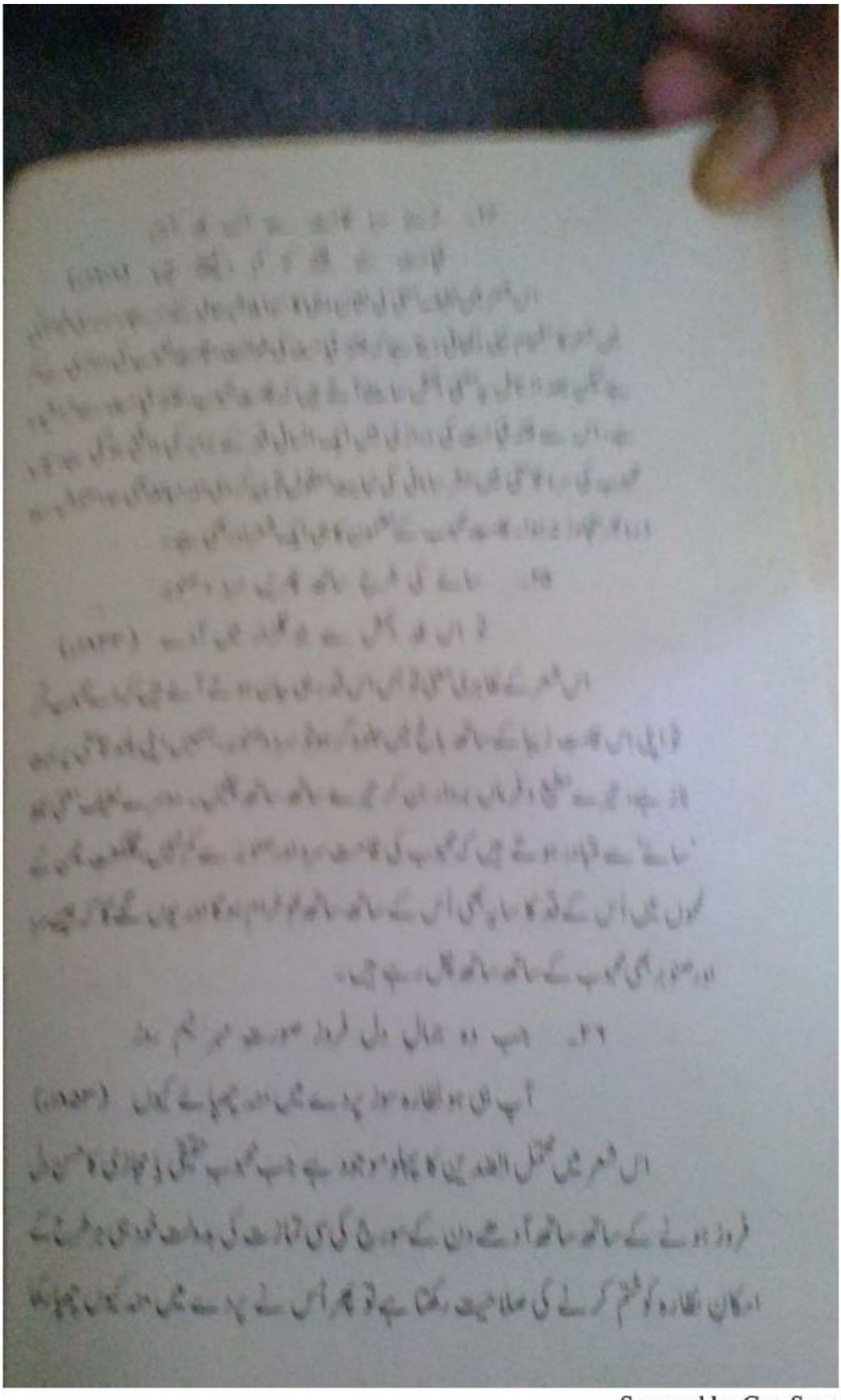

Scanned by CamScanner

ہیں اور دوسرے معنی یہ کہ جب اس کا حسن خود ہی قاتل ہے تو پھر اسے تلوار کی کیا ضرورت ہے۔ لہٰذا دونوں مطلب غالب کے اس شعر سے نکالے جا سکتے ہیں۔

۲۷۔ [illegible] کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو (بعد از ۱۸۲۶ء)

یہ شعر حسن التفات کی نہایت روشن مثال ہے اس لیے حالی نے اس کا حوالہ دیا ہے۔ مفہوم یہ کہ جب ہم نے محبوب کو اس کا وعدہ دلایا کہ ہم سے وعدہ کرو کہ ہمارا ضرور خیال کرو گے تو اس نے یقین دلایا کہ ہمارے ہی سر کی قسم کھا کر کہ وہ یہ عہد ضرور پورا کرے گا اور دوسرے متضاد معنی یہ کہ تمہارے سر کی قسم ہم کبھی تمہارا خیال نہیں کریں گے۔

۲۸۔ الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو (۱۸۵۳ء)

حالی سمیت بہت سے شارحینِ غالب نے اس شعر کو ادا کے حوالے سے درج کیا ہے کہ محبوب تم آئینے میں اپنے عکس کو بھی گوارا نہیں کرتے اگر تمہارے جیسے دو چار اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو اور دوسرے معنی یہ کہ اگر تم جیسے خوبرو شہر میں چند ایک اور بھی ہوں تو خود تمہاری حالت کیا ہو جبکہ تمہاری انانیت اور نرگسیت خود اپنے عکس آئینہ کو بھی پسند نہیں کرتی۔

۲۹۔ کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے (بعد از ۱۸۲۱ء)

شعر کے دوسرے معنی چونکہ نہایت شوخ ہیں اس لیے بہتر ہوگا کہ حالی کی زبانی سے جائیں۔

"ہمارے بھی منہ میں زبان ہے اس میں دو معنی رکھے ہیں، ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں اگر بولنے پر آئیں تو تم کو قائل کر دیں گے، اور دوسرے شوخ معنی یہ کہ ہم زبان سے چکھ کر بتا سکتے ہیں کہ غیر

Scanned by CamScanner

لے بوسہ لیا ہے یا نہیں!" (۲۰)

۳۰۔ لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے (۱۸۲۱ء)

۱۔ محبوب میرے آوارہ دل سے لاپروائی برت رہا ہے اور سمجھ رہا ہے کہ دل عاشق کے پاس ہی ہے، جب چاہے گا عاشق سے مانگ لے گا یا چھین لے گا۔

۲۔ میرا دل اس حد تک آوارہ ہے کہ وہ اب محبوب کے پاس بھی نہیں رہا، اور محبوب اس زعم میں ہے کہ دل عاشق اُس کے پاس سے بھلا کہاں جا سکتا ہے!

۳۱۔ ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی (۱۸۲۱ء)

اس شعر کا متن کچھ اس طرح مرتب ہوا ہے کہ اچھا بھلا قاری بھی اولاً یہی سمجھتا ہے کہ اگر غیر کو محبوب سے محبت ہے تو اس صورت میں کیا ہم اپنے دشمن ہیں کہ محبوب سے محبت کریں گے! حالانکہ بعد از تامل درست معنی تک رسائی ہوتی ہے۔ متکلم گویا محبوب کی اس بات کا جواب دے رہا ہے کہ "غیر مجھ سے فی الواقعی محبت کرتا ہے" یہ جملہ شعر میں مقدر ہے، عاشق اس کا جواب نہایت مسکت انداز میں دیتا ہے کہ چلیں ایک لمحے کے لیے مان لیتے ہیں کہ غیر آپ سے محبت کرتا ہے، لیکن یہ بھی تو سوچیے کیا کوئی شخص خود اپنا دشمن ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے نہیں، تو پھر سوچو کہ کیا ہم اپنے دشمن ہیں کہ تم سے محبت نہ کریں۔ تم سے محبت نہ کرنا خود اپنے آپ سے دشمنی کرنا ہے۔

۳۲۔ ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے (بعد از ۱۸۴۷ء)

یہ شعر اس اعتبار سے ذو معنی قرار پاتا ہے کہ متکلم کے لہجے (زاویہ نظر) کے بارے میں سخن فہم قارئین دو گروہوں میں منقسم دکھائی دیتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

ا۔ ہماری اُمید پرستی کا عالم ملاحظہ ہو کہ ہم اس محبوب سے وفا کی اُمید رکھتے ہیں جو وفا سے آشنا ہی نہیں، جو وفا کے معنی ہی نہیں جانتا۔

ب۔ ہماری اُمید وفا کا انجام اسی بات سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ہم اس شخص سے وفا کی اُمید رکھتے ہیں جو سرے سے وفا نام کی کسی چیز سے آگاہ ہی نہیں۔ پہلے مفہوم میں اعتقاد رجائیت اور دوسرے میں حقیقت پسندانہ نا اُمیدی اور یاس نیز طنز کا پہلو ہے۔ ہم دوسرے مفہوم سے زیادہ متفق ہیں کہ بقول غالب۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہیے

۳۳۔ پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے (۱۸۲۱ء)

"ہم پھر اس محبوب پر جان دے رہے ہیں جس نے ہم سے کبھی وفا نہ کی۔ دوسرے مصرع کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ ہم نے زندگی کے وہی طریقے اختیار کر لیے ہیں جو پہلے تھے، دوسرا یہ کہ وہی محبوب پھر ہماری زندگی کا سہارا بن گیا ہے یعنی اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں"۔(۲۱)

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے (۱۸۵۳ء)

یعنی پہلا مفہوم یہ کہ ہماری زندگی نہیں بدلی، اس بے وفا پر مرنا ہی ہماری زندگی کا وظیفہ ہے۔ دوسرے معنی میں قولِ محال کا لطف مستزاد ہے کہ اسی بے وفا پر مرنا ہماری زندگی قرار پایا ہے۔

۳۴۔ ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر
خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے (۱۸۲۱ء)

۱۔ اے محبوب ہمارے بارے میں یہ سمجھنا کہ تمہارے طرزِ عمل سے ہمارا دل میلا اور ہماری طبیعت میں تکدر پیدا ہو گا درست نہیں کیوں کہ عاشقوں کی مٹی (سرشت طبیعت) میں غبار نہیں ہوتا۔

۲۔ محبوب تمہاری جفاؤں سے ہم خاک بھی ہو جائیں تو ہماری خاک آپ کی طبیعت کے لیے تکدر کا باعث نہیں ہوگی کیوں کہ عشاق کی خاک، راکھ بھی غبار (تکدر) سے مبرا ہوتی ہے۔ گویا ہم مر کر بھی آپ کی خاطر کے لیے رنج کا سبب نہیں ہوں گے۔

دور بیٹھا غبارِ میرؔ اُس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

۳۵۔ خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے (۱۸۵۳ء)

۱۔ محبوب ہمیں تمہارے نام سے بھی الفت ہے اس لیے خط لکھنے سے باز نہیں رہ سکتے، ہم جانتے کہ تم ہمارے خط کا جواب نہیں دو گے بلکہ شاید اسے پڑھو گے بھی نہیں، لیکن سرنامے پر اور پھر خط میں تمہارا نام مع القابات شیریں رقم کرنے کا جو لطف ہے ہم اُس سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔

۲۔ ہم تمہارے برائے نام عاشق ہیں، لہٰذا کسی خاص مطلب و مدعا کے نہ ہوتے ہوئے بھی خط لکھتے رہیں گے۔

۳۶۔ زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے (۱۸۱۶ء)

حالی کے الفاظ میں

''''کون اُٹھاتا ہے مجھے'' اس کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ زندگی میں تو مجھے محفل سے اُٹھا دیتے تھے، اب مرنے کے بعد دیکھوں مجھے وہاں

Scanned by CamScanner

سے کون اُٹھاتا ہے؟ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ محفل سے تو اُٹھا دیتے تھے، دیکھوں اب میرا جنازہ کون اُٹھاتا ہے"۔ (۴۲)

یہ مثال ادماج کی قرار پائے گی۔

۳۷۔ ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی (۱۸۵۵ء)

صنعتِ ادماج کی اس سے بہتر مثال شاید ہی کوئی اور ہو۔ گو لفظ 'باد پیمائی' پر ذو معنویت کا مدار ہے، لیکن یہ ایہام اس لیے نہیں ہے کہ دونوں مصرع مل کر شعر کے دو مفہوم بنا رہے ہیں۔

۱۔ بہار کا موسم ہے۔ ہوا میں جیسے شراب گھل مل گئی ہے، اس لیے بہار کی ہوا کھانا گویا شراب پینا ہے۔ ان معنی میں 'باد پیمائی' مبتدا اور بادہ نوشی خبر ہوں گے۔

۲۔ اگر بادہ نوشی کو مبتدا اور باد پیمائی کو خبر قرار دیں اور 'باد پیمائی' کا مطلب محاورے کے مطابق فضول و عبث کام کرنے کے لیں تو مطلب ہوگا کہ آج کل موسم بہار کی ہوا میں شراب رچ بس گئی ہے اس لیے بادہ نوشی، محض باد پیمائی یعنی بے کار اور لاحاصل کام ہے۔ شراب الگ سے پینے کی کیا ضرورت ہے محض ہوا کھانا چاہیے۔

غالب نے تفتہ کو خط میں لکھا تھا کہ "بھائی! شاعری قافیہ پیمائی نہیں، معنی آفرینی ہے" اور معنی آفرینی کا سب سے موثر وسیلہ یہی ہے کہ شعر کا متن اس طرح مرتب کیا جائے کہ اُس میں ایک سے زیادہ معنی متبادر ہوتے ہوں۔ صنعتِ ادماج سے غالب کی غیر معمولی رغبت کی وجہ اسی معنی آفرینی کا حصول بھی ہے اور صنعتِ ادماج غالب کی معنی آفرینی کی بازیافت کا ایک وسیلہ اور طریقہ کار بھی ہے۔

Scanned by CamScanner

حوالہ جات

۱۔ حالی، الطاف حسین، "یادگار غالب" ص ۱۳۰، اشاعت اول نامی پریس کان پور، ۱۹۹۷ء۔

۲۔ اسلوب احمد انصاری، مضمون 'کلام غالب کا ایک رخ' مشمولہ 'تنقید غالب کے سو سال' مرتب سید فیاض محمود، ص ۵۰۹۔ پنجاب یونیورسٹی پریس لاہور ۱۹۶۹ء۔

۳۔ نجم الغنی رام پوری، 'بحر الفصاحت' ص ۱۰۵۵، اشاعت اول ۱۹۲۶ء، مطبع نول کشور، لکھنؤ۔

۴۔ حوالہ سابق، ص ۱۰۹۳۔

۵۔ سجاد مرزا بیگ دہلوی، 'تسہیل البلاغت' ص ۱۷۸۔ محبوب المطابع، برقی پریس دہلی، اشاعت اول ۱۹۱۵ء۔

۶۔ حوالہ سابق ص ۱۷۹۔

۷۔ سحر، دیبی پرشاد، 'معیار البلاغۃ' ص ۵۲۔ نول کشور پریس، لکھنؤ، اول ۔ ۱۹۳۳۔

۸۔ حوالہ سابق، ص ۵۲۔

۹۔ نذیر احمد، 'محاسن الفاظ غالب' ص ۱۵۱، کتابیات، لاہور، ۱۹۶۹ء۔

۱۰۔ حوالہ سابق ص ۱۶۴۔

۱۱۔ سحر، ابوالفیض، 'صنائع معنوی' مشمولہ 'درس بلاغت' ص ۴۱، ۴۰۔ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، اول ۱۹۸۱۔

۱۲۔ بجنوری، عبدالرحمن۔ 'محاسن کلام غالب' ص ۲۰، ۲۱، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۵۔

۱۳۔ حوالہ سابق ص ۲۱۔

Scanned by CamScanner

۱۴۔ عابد علی عابد۔ 'البدیع' ص ۲۶۹، مجلس ترقی ادب لاہور اول۔ ۱۹۸۵ء۔

۱۵۔ حالی، الطاف حسین خواجہ، 'یادگار غالب' ص ۱۳۰۔

۱۶۔ مہر، غلام رسول، 'نوائے سروش' ص ۱۱۰ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، سن ندارد۔

۱۷۔ حالی، الطاف حسین خواجہ، 'یادگار غالب' ص ۱۳۰۔

۱۸۔ فاروقی، شمس الرحمٰن، 'تفہیم غالب' ص ۶۳ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء۔

۱۹۔ حالی، الطاف حسین خواجہ، یادگار غالب ص ۱۳۱، ۱۳۲۔

۲۰۔ حوالہ سابق، ص ۱۳۳

۲۱۔ مہر، غلام رسول، نوائے سروش ص ۵۴۵

۲۲۔ حالی، 'یادگار غالب' ص ۱۳۳

Scanned by CamScanner

محمد سعید

دیوانِ غالب نسخۂ عرشی کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

In the portion consisting of the second part of the research based/critical review of Deewan-e-Ghalib Nuskha-e-Arshi, the noteworthy points are distributed in three sub-divisions. In the first part, a review of the doubt in the controversial Nasakh script will be presented. The second sub-division will comprise of the debate on Nuskha-e-Arshi's style of script and spelling. In the third part, some extra-ordinary issues will be argued with brevity.

دیوانِ غالب نسخۂ عرشی کے تحقیقی اور تنقیدی جائزے کے دوسرے حصے پر مشتمل اس باب میں بھی اس کے محلِ نظر مقامات کو تین ذیلی حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہاں پہلے حصے میں نسخۂ عرشی کے اختلافِ نسخ کے اشکال کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔ دوسرا ذیلی حصہ، نسخۂ عرشی کے املا اور رسم الخط کے مباحث پر مشتمل ہوگا اور پھر تیسرے حصے میں کچھ دیگر معمولی اور غیر معمولی مباحث کو اختصار کے ساتھ احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کی جائے گی۔

نسخۂ عرشی میں اختلافِ نسخ کے اندراج میں کوئی خاص قاعدہ یا طریقۂ کار اختیار نہیں کیا گیا۔ اس میں چار طرح کے اختلاف آئے ہیں۔ پہلی قسم کاتبوں کے املا اور رسم الخط وغیرہ کے اختلاف کی ہے۔ دوسری کاتبوں کے سہو پر مبنی ہے۔ تیسری، متن کے اختلاف اور چوتھی،

Scanned by CamScanner

یکساں نہیں۔ ان میں کتابت کی غلطیاں بھی ہیں اور خود میرزا صاحب
کی ترمیمیں اور اصلاحیں بھی۔ اختلافات نسخ شاعر کی ذہنی رفتار کے
تمام نقوش و آثار پر مشتمل ہونے کے باعث خصوصی توجہ کے مستحق تھے۔
اس لیے نسخۂ بھوپال (۱۸۴۱ء) سے شروع کر کے "انتخاب غالب"
(۱۸۶۹ء) اردو کے مسودے تک ہر اصلاح کو بصورت حواشی ضرور تحریر
میں لانے کی کوشش کی گئی ہے"۔ (مقدمہ، ص ۷۷)

اس اقتباس سے وضاحت نہیں ہوتی کہ کس نوعیت کے اختلاف دیے ہیں اور کون
سے نہیں دیے کیونکہ "ہر اصلاح" یا "ہر اختلاف" تو نسخۂ عرشی میں درج نہیں ہو سکا۔
اس کے علاوہ "اختلاف نسخ" درج کرتے ہوئے چند الفاظ کے بارے میں مولانا
عرشی نے وضاحت کی ہے گویا ان چند الفاظ کے اختلاف درج کرنے کا کوئی قاعدہ مقرر کرنے
کی کوشش کی ہے۔ ایسی وضاحتیں دو تین جگہ نسخۂ عرشی کے "اختلاف نسخ" ہی میں آئی ہیں کہ
ایک لفظ کا مکمل بار اختلاف دیتے ہوئے یہ لکھ دیا ہے کہ اب آئندہ اس نوعیت کے اختلاف
درج نہ کیے جائیں گے۔ ایسی چند وضاحتیں ملاحظہ ہوں:

(۱) "دیوان کے نسخوں میں "ہ" پر ختم ہونے والے الفاظ بحالتِ تحریف کبھی "ی" سے
اور کبھی "ہ" سے لکھے گئے ہیں۔ خود غالب کے اپنے قلم کی تحریریں بھی مختلف ہیں۔
میں نے آج کل کے قاعدے کے مطابق ہر جگہ "ی" سے لکھا ہے اور جہاں کوئی نسخہ
اس رواج کے خلاف تھا، وہاں اختلاف نسخ میں اس کا حوالہ دینا ضروری نہیں
گردانا"۔ (نسخۂ عرشی، ص ۱۳۲)

(۲) "غالب کا املا پانو ہے۔ اس لیے آئندہ بغیر اختلاف ظاہر کیے غالب کا املا اختیار کیا
گیا ہے" (نسخۂ عرشی، ص ۱۳۴)

(۳) "تجھ اور مجھ کے مرکبات آئندہ بھی جگہ جگہ بے وہ کے لکھے گئے ہیں۔ اس لیے اس

Scanned by CamScanner

اختلاف کو نظر انداز کر کے ہر جگہ ہ کے ساتھ لکھا گیا ہے''۔ (نسخۂ عرشی، ص ۱۹۴)

(۳) ''غالب کا یہ ادبی عقیدہ تھا کہ ذال، فارسی اور اُردو حرف نہیں ہے اس لیے وہ ذال والے فارسی اور اُردو لفظوں کو ''ز'' سے لکھتے تھے۔ میں نے بھی ہر فارسی و اُردو لفظ میں اُن کا اتباع کیا ہے مگر آیندہ اختلاف نسخ میں اس کا ذکر نہیں کیا''۔

(نسخۂ عرشی، ص ۱۹۴)

جب یہ بات خود طے کر دی ہے کہ اس نوعیت کے الفاظ کے اختلاف آئندہ درج نہیں کیے جائیں گے تو اصولاً یہ چاہیے تھا کہ آئندہ ''اختلاف نسخ'' کو ایسے اختلافات سے گراں بار نہ بنایا جائے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ ان وضاحتوں کے باوجود بعد میں بھی ایسے اختلاف درج کیے جاتے رہے ہیں (اور بعض نہیں بھی کیے) ان میں سے نمبر ایک اور نمبر تین کے تحت آنے والے اختلاف تو ان وضاحتوں کے بعد بھی کثرت سے درج ہوئے ہیں۔

نسخۂ عرشی کے ''اختلاف نسخ'' کا جائزہ لیں تو تین طرح کے اشکال اس میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ بعض اہم اختلافات درج ہونے سے رہ گئے ہیں۔ دوسرا یہ کہ کچھ غلط اختلاف درج ہو گئے ہیں اور تیسرا ''ح'' کے حوالے سے درج ہونے یا نہ ہونے والے اختلاف خاصے محل نظر ہیں۔ ذیل میں ''اختلاف نسخ'' کے ان تین طرح کے اشکال کو اسی ترتیب کے ساتھ مثالوں سے ثابت کیا جاتا ہے۔

(ا) نسخۂ عرشی کے محذوف اختلاف نسخ: ڈاکٹر گیان چند کا نسخۂ عرشی کے بارے میں ارشاد ہے کہ:

> ''اس کا اختلاف نسخ کا باب اتنا جامع ہے کہ اس کی مدد سے غالب کے تمام اہم خطی اور مطبوعہ مجموعوں کے مشمولات کے ایک ایک لفظ کا پتا چل جاتا ہے''۔ (رموز غالب، ص: ۴۰۸)

اس بات میں تو کچھ شبہ نہیں کہ نسخۂ عرشی کے اختلاف نسخ ''اہل تحقیق کی جنت ہیں''

Scanned by CamScanner

ہوتی ہے جو ہر ایک مجموعے پر روشنی ملتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر گیان چند کے اس بیان سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ نسخۂ عرشی طبع اول کی نسبت طبع ثانی کے اختلاف نسخ زیادہ جامع ہیں۔ طبع ثانی میں مولانا عرشی نے ہونے والے ماخذ استعمال کیے ان کے اختلاف تو اضافہ ہونے ہی تھے لیکن ایسے ماخذ جو طبع اول میں ان کے پیش نظر تھے، مگر وہاں ان کے مکمل اختلاف ظاہر نہ ہو سکے تھے لیکن طبع ثانی میں درج ہیں۔ ان کا بھی احاطہ کر لیا ہے (اس مقالے کے چوتھے باب میں یہ ثابت کیا جا چکا ہے) اس کے باوجود نسخۂ عرشی طبع اول یا طبع ثانی میں سے کسی کے "اختلاف نسخ" کے بارے میں یہ کہنا کہ "اس کی مدد سے غالب کے تمام اہم قلمی اور مطبوعہ مجموعوں کے مشمولات کے ایک ایک لفظ کا پتا چل جاتا ہے"۔ خلاف واقعہ ہے۔

ذیل میں نسخۂ عرشی کے محذوف اختلاف نسخ درج کیے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ نسخۂ عرشی سے دیوان کے مجموعوں کے "ایک ایک لفظ کا پتا" نہیں چل سکتا۔ ان کے اندراج سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس ذیل میں صرف وہ اختلاف لیے ہیں جو اہم ہیں۔ ان کے علاوہ، الفاظ پر نقطے یا گاف کا مرکز (کشش) لگنے سے رہ جانے والے الفاظ اور ہائے مخفی (ہ) پر ختم ہونے والے الفاظ (جو محرف صورت میں بھی اسی طرح ہیں اور ان میں سے بعض کو نسخۂ عرشی میں درج بھی کیا ہے) کو یہاں درج نہیں کیا جا رہا۔ محذوف اختلاف درج کرتے ہوئے ماخذ کی علامتیں وہی رکھی ہیں جو نسخۂ عرشی میں ہیں (اور جن کی وضاحت دیباچے میں بھی کی جا چکی ہے) نیز نسخۂ عرشی کے حصہ "یادگار نالہ" میں ایک قصیدے کا مشترک ماخذ "الہلال" اخبار بھی ہے اور مولانا عرشی نے اختلاف میں اسے بھی رکھا ہے۔ اس میں سے جو اختلاف محذوف رہ گئے انہیں بھی درج کیا ہے۔ "الہلال" کا مکمل حوالہ یہ ہے: ہفت روزہ "الہلال" کلکتہ، جلد: ۴، شمارہ: ۲۴، ۱۷ جون ۱۹۱۴ء، (عکسی اشاعت، الہلال اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۱ء) ص: ۴۶۳۔ ذیل کے محذوف اختلاف دیتے ہوئے "استدراک" کو بھی دیکھ لیا گیا ہے۔ ان اختلاف میں سے جن پر یہ نشان (+) لگا ہے وہ نسخۂ عرشی میں ہیں لیکن کسی دوسرے

[illegible]

[illegible]

	نسخۂ عرشی	[illegible]
۱۲:۱۴	[illegible]	[illegible] مطبوعہ ظاہر کیا ہے۔
۱۹:۴،الف	شاید کہ مر گیا ترے رخسار دیکھ کر	[illegible]
۲۶:۱۲،ب	[illegible]	[illegible]
۵:۹۰	[illegible]	[illegible] اس شعر کے درمیان [illegible] لکھا ہے۔
۱۳۲:۵،الف	کیوں اسے گوہر نایاب تصور کیجیے؟	م، قصور ([illegible])
۱۳۹،۳:۱۰،الف	[illegible] جام زمرد کی طرح داغ پلنگ	[illegible] ہے
۱۳۹:۱۲،ب	یک طرف [illegible]	[illegible]
۱۳۹:۱۵،الف	دیدہ تا دل، اسدؔ، آئینۂ یک پرتو شوق	[illegible] (بجائے اسدؔ)
۱۵۰:۸،ب	وصل، آئینۂ خواب گران شیریں	ق، وصل ساز گرانباری خواب شیریں
۱۵۱:۲،الف	جلوہ پرداز ہو نقش قدم اس کا، جس جا	ق، ح، جلوہ تحریر
۱۶۰:۵،الف	شمار سبحہ، مرغوب بت مشکل پسند آیا	م، ح، ب
۱۹۱:۳	بجز قیس، اور کوئی نہ آیا بروئے کار	مرتب ح نے اسے غیر مطبوعہ ظاہر کیا ہے۔
۱۹۱:۸	تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن، اسدؔ	مرتب ح نے اسے بھی غیر مطبوعہ ظاہر کیا ہے۔

	ہم سے [illegible]	ما، [illegible]
۱۶۹: ۵، ب	دل، گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی	ما، خیالِ مے و ساغر
۱۶۹: ۶، الف	گر نفس، جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا	ع، جادۂ سرمنزل
۱۶۹: ۳، ب	ہاں سرِ پُر شور، بے خوابی سے تھا دیوار جو	م، سرِ پُرشور
۱۶۹: ۶، الف ۱۶۹: ۱۱	پھر دی اپنی [illegible]	مد میں اس شعر کے درمیان میں ''قطعہ'' لکھا ہے۔
۱۶۹: ۱۰، الف	واں [illegible] بیچارہ [illegible] رسوائی	م، بیچارہ
۱۶۹: ۳	شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا	مد، صفحہ ۲۵ پر اس غزل کے اختتام پر، اگلے صفحے سے نئی غزل ''دوست غمخواری'' کے لیے لفظ ''مطلع'' لکھا ہے۔
۱۷۰: ۸، ب	رازِ مکتوب، بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا	ع، بے
۱۷۲: ۹، الف	گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی	م، چاہی ہی
۱۷۳: ۱	عشرتِ قتلگہِ اہلِ تمنا مت پوچھ	ما میں اس کے بعد ترتیبِ اشعار یہ ہے: کی میرے قتل، لے گئے خاک، عشرتِ پارۂ دل
۱۷۳: ۷، الف	زہرہ، گر ایسا ہی شام ہجر میں ہوتا ہے آب	م، زہر (سہوِ کاتب)
۱۷۳: ۷، ب	پرتوِ مہتاب، سیلِ خانماں ہو جائے گا	م۔ جانماں
۱۷۵: ۳، ب	کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا	ما، دخشت (سہوِ کاتب)
۱۷۶: ۳	زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی	ع میں یہ شعر نمبر ۵ کے بعد ہے
۱۷۷: ۳، ب	آتشکدہ، جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا	ما، آتشکدہ (سہوِ کاتب)

Scanned by CamScanner

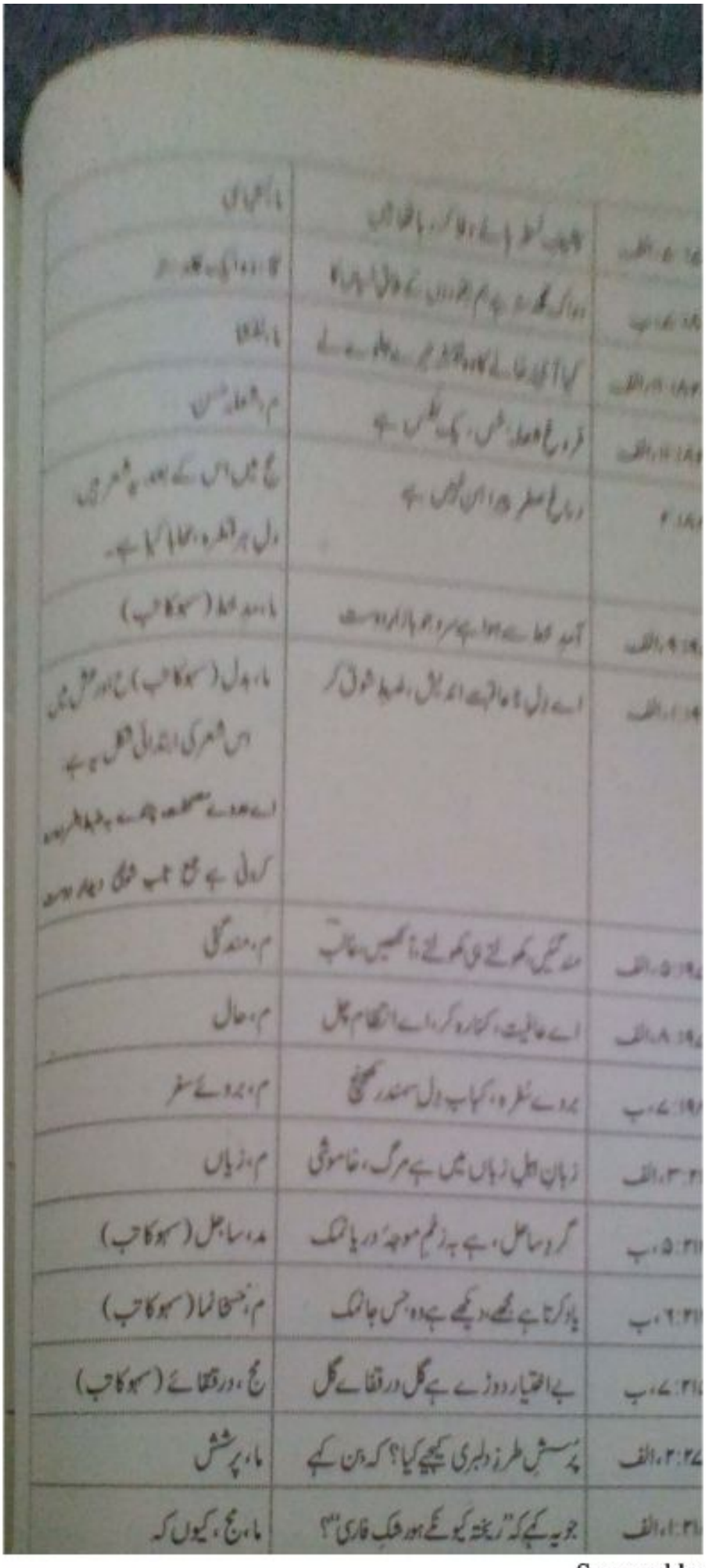

۲۲۷:۹، ب	ذرّے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں	ما، دروازوں کے
۲۳۱:۲، الف	گل سے کرتی ہے، اثباتِ تراوش، گویا	ما، کرتی ہیں
۲۳۸:۹، الف	قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر	ج، یعقوت (سہو کاتب)
۲۳۷:۱	شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں	ما میں یہ شعر اس غزل کے درمیان والے حاشیے پر مقطع سے شروع ہو کر، اوپر کی طرف عنوان "غزل" تک لکھا گیا ہے۔ جس کا خط اس ایڈیشن کے کاتب سے صاف اور مختلف ہے۔ شاید غالب نے تصحیح کے وقت لکھا ہو۔ الف، کو
۲۷۱:۵، ب	سراسر رنج بالیں ہے، سراسر تن بار بستر ہے	ما، سراسر رنج
۲۸۸:۵، الف	بسے وقفہ دو عالم کی حقیقت معلوم	ما، "معلوم" سے پہلے بھی "کی" (سہو کاتب)
۲۹۶:۳، الف	غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے	ما، اشک ہے
۳۰۱:۳، ب	جانتا ہے جو پرستشہائے پنہانی مجھے	ما، پرشتہائے
۳۰۵:۵، الف	دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا	ما، "اس" کے بعد "نے" حذف ہے
۳۳۹:۸، الف	ہم اور فسردن، اے تجلی، افسوس!	م، فردن (سہو کاتب)
۳۴۲:۳، ب	خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں؟	ج، مد، برف آب
۳۸۳:۱، الف	حق گوے و حق پرست و حق اندیش و حق شناس	الہلال، حق گو و حق پرست

۲۸۵:۲، ب	لبِ ہر قطرہ عجب میں ادا ہوے اتمام	اہمال: انگشت میں
۲۸۵:۱۲، الف	جو واں نہ کر سکا وہ کھاتا ہے ٹھوکر	اہمال: واں کر سکا وہ کھائے ٹھوکر

مولانا عرشی نے نسخۂ عرشی طبع ثانی میں ۲۱ مآخذ سے استفادہ کیا تھا۔ ان اکیس میں سے میرے سامنے صرف سات مآخذ ہیں جن کے تقابل سے نسخۂ عرشی سے مندرجہ بالا مختلف اختلاف نسخ ظاہر ہوئے۔ بقیہ ۱۴ مآخذ کے حوالے سے مختلف اختلاف نسخ کے بارے میں فی الوقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

نسخۂ عرشی کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد فروری ۱۹۸۸ء میں کالی داس گپتا رضا کا مرتبہ دیوانِ غالب (کامل) پہلی بار شائع ہوا۔ گپتا رضا نے "نسخۂ رضا" کی ترتیب میں "اختلاف نسخ" کے حوالے سے، نسخۂ عرشی پر بھروسا کر لیا اور اس میں کہیں بھی اختلاف نہ دیے۔ مقدمے میں وہ اختلاف نسخ کے حوالے سے نسخۂ عرشی کی طرف رجوع کرنے کو کہتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "نسخۂ رضا" میں:

> "اختلاف نسخ کو کہیں بھی واضح نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کام نسخۂ عرشی میں احسن طریقے سے انجام دیا گیا ہے۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ کہیں شبہ ہو تو "دیوانِ غالب" نسخۂ عرشی سے رجوع کیا جائے"۔ [لے]

گپتا رضا نے، "نسخۂ رضا" کے آخری ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن (۱۹۹۵ء) میں بھی اختلاف نسخ کے حوالے سے نسخۂ عرشی کی طرف رجوع کرنے کے لیے کہا ہے (ص:۱۰)۔ بس بیاضِ غالب بخطِ غالب کے اختلاف (جو نسخۂ عرشی کے اختلاف کے ساتھ درج نہ ہو سکے تھے اور "استدراک" میں آئے) کو اضافہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ کسی نسخے کا اختلاف نہیں دیا گویا نسخۂ عرشی پر بھروسا کیا۔ غرض یہ کہ ڈاکٹر گیان چند اور گپتا رضا نے بغیر تحقیق کے نسخۂ عرشی پر بھروسا کیا جو غلط نتیجے کا باعث بنا۔

Scanned by CamScanner

صورت میں ... درج

	نسخۂ عرشی	[illegible]	[illegible]
۳ : ۹ ، الف	جوشِ بہار و تابش سے ہوئی عریاں آخر	ق پہلے "بہار و تابش"۔ غالب نے اس پر "ن" بنا کر حاشیے میں اصلاح کی ہے، مگر مرتب ع نے اسے ظاہر نہیں کیا۔	["تابش" میں پہلے "جوشِ بہار و تابش" کی جگہ "بہار مالی تابش" تھا"۔ ع، ص: ۲۹۵]
۳۳ : ۳ ، الف	نقش بہ حیرت ہے سب طرز نا گیرائی کہاں	قا: نا گیرائی	[قا: طرز نا گیرائی]
۵۰ : ۳ ، الف	عمر سے آگ کے اک بحر دریا ہو گیا	قا: "دشوی" (سہو کاتب) اور حاشیے میں لکھا ہے: "نسخۂ حمیدیہ والوں نے "دشوی" (سہو کاتب) کو "دھوئیں" سے بدل دیا ہے"	[قا میں ایسا کوئی حاشیہ نہیں آ سکتا۔ یہ حاشیہ "ط" میں ہوگا]
۱۶۰ : ۳ ، الف	بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا	قا میں یہ مصرع شعر نمبر ۲ کا ہے۔ غالب نے اسے یہاں قلم زد کیے بغیر دوسرے مصرعے کے لیے ایک باتخلص مصرع بہم پہنچا کر پورے شعر کو غزل کے آخر میں حاشیے پر لکھ دیا ہے۔	[یہ باتخلص مصرع قا میں اس غزل کے آخر میں حاشیے پر غالب کے قلم کا اضافہ نہیں ہے؟]

۱۹۱: ۳، الف	آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست	ق، قا، جز قیس اور کو نہ ملا عرصہ تپش	[قا، تپش]
۱۹۶: ۳، ب	بنازش لطافت صد رنگ دعویٰ پارسائی کا	سب کے علاوہ، لطافت	[ما میں درست طور پر ''لطافت'' ہی ہے]
۱۹۹: ۵، الف	فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ	ح، تجھکو یاد	[ح میں درست طور پر ''اس کو یاد'' ہے]
۱۹۹: ۲، الف	ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب	مد کے علاوہ، قطرہ	[ما، درست طور پر، قطرے]
۱۷۵: ۱، الف	دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا	ق، قا، الف نہ کی گو سوز دل سے	[قا، سوزِ غم سے]
۱۷۶: ۵	پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال	یہ شعر ق کے حاشیے کا ہے، مگر مرتب ح نے اس کا ذکر نہیں کیا۔	[''یہ شعر قلمی دیوان کے حاشیے پر درج ہے''۔ ح، ص: ۳۴]
۱۸۰: ۳، ب	یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا	ما، پردا	[ما، درست طور پر، پردہ]
۱۸۱: ۶، الف	ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ	مد کے علاوہ معمورہ	[لیکن مج، معموزہ، (سہوِ کاتب)]
۱۸۲: ۱۱، الف	کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے	مد کے علاوہ، جلوہ	[مگر ما میں درست طور پر، جلوے۔]

Scanned by CamScanner

۱۹۰: ۷	پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب	یہ غزل ق کے حاشیے میں مندرج ہے، مگر مرتب ح نے اس کا ذکر نہیں کیا۔	[''پوری مرغوب غزل ''پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب'' قلمی نسخے کے حاشیے پر غالباً غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی موجود ہے''۔ ح، ص ۵۳]
۱۹۵: ۲، الف	نغمے کے پردے میں ہے جو تماشائے دماغ	مد کے علاوہ، پردہ	[م، ح میں درست طور پر ''پردے'' ہی ہے]
۲۱۱: ۷، ب	شگفتگی، بے صیدِ گل خرابیِ شمع	م، خرابیِ شمع	[م، خرابیِ شمع، (سہو کاتب)]
۲۱۵: ۷، الف	تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک	مد کے علاوہ، جلوہ	[ما، درست طور پر، جلوے]
۲۱۸: ۶، ب	ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کے عذرِ مستی ایک دن	ما، ہستی (سہو کاتب)	[حالانکہ ما میں درست طور پر ''مستی'' ہی ہے۔]
۲۲۳: ۴، الف	دل لگا کر، لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا	ح، ان کو (سہو کاتب)	[ح میں اور نسخۂ عرشی کے متن میں دونوں جگہ ''اُن کو'' ہی ہے۔]

Scanned by CamScanner

۲۳۰: ۸، الف	رنگ شکستگی گل و لالہ پریشاں کیوں ہے؟	ج، شکستگین (سہو کاتب)	[حالانکہ ج میں بھی درست طور پر "شکستگین" ہی ہے۔]
۲۳۵: ۴، ب	لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں	ما، بنا (سہو کاتب)	[ما، درست طور پر "بناؤ"]
۲۳۶: ۹، الف	چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ	ج، ہر ایک	[ج: "ہر اک" ہی ہے۔]
۲۳۸: ۵، الف	تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں	ج کے علاوہ، پردہ	[لیکن ج میں درست طور پر "پردے" ہی ہے۔]
۲۷۳: ۸، الف	دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے	ما، آپ ہی	[ما، درست طور پر "آپ بھی"۔]
۲۹۳: ۱، ب	کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے	ما، کھینچتا - کھنچ	[مگر ما میں درست طور پر یہ دونوں "ن" کے ساتھ "کھینچتا" اور "کھنچتا" ہیں۔]

ج نسخۂ عرشی طبع ثانی میں "ح" (نسخۂ حمیدیہ ۱۹۲۱ء) کے حوالے سے محذوف اختلافِ نسخ:

نسخۂ عرشی		ح کے محذوف اختلاف
۱۶۱: ۲، الف	ہوائے سیرِ گل، آئینۂ بے مہریِ قاتل	ح، حجابِ سیرِ گل
۱۶۱: ۲، ب	کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا	ح، غلطیدن

۱۶۰:۳، الف	جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار	ح، اور کون ملا عرصۂ جنوں
۱۶۱:۳، الف	آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست	ح، کیا ہے عرض
۱۶۱:۵، ب	جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا	ح، مژگاں جو وا ہوئی
۱۶۲:۹، الف	شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا	ح، نمک باندھا
۱۶۳:۳، الف	تھی نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند	ح، دشواری شوق
۱۶۳:۹، الف	مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ	ح، مر گیا صدمۂ آواز سے قُم کی غالبؔ
۱۶۹:۱، الف	غم فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو	ح، سیرِ گل مت دو
۱۶۹:۷، الف	اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو	ح، اور خونِ دو عالم معاملہ
۱۶۹:۹، الف	موجِ سرابِ دشتِ وفا نہ پوچھ حال	ح، کا بیاں نہ پوچھ
۱۷۰:۶، ب	اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا	ح، ہاں اس معاملے میں تو
۱۷۱:۵، الف	جاں در ہوائے یک نگہِ گرم ہے اسدؔ	ح، نفسِ گرم
۱۷۲:۶، الف	بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار	ح، چشمِ جنوں میں نگہ غبار
۱۷۲:۷، الف	باغِ شگفتہ، تیرا بساطِ نشاطِ دل	ح، ہوائے دل
۱۷۳:۶، الف	گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائیگا	ح، گر نہ احوالِ شب
۱۷۴:۱، الف	لے تو لوں سوتے میں اس کے پانو کا بوسہ مگر	ح، بوسہ ہائے پا مگر
۱۷۴:۸، ب	خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا	ح، جامِ بادہ یکسر

یہ سب ،نسخۂ عرشی کے حصہ ''نوائے سروش'' کی ردیف الف کی چند ابتدائی غزلوں سے لیے گئے ہیں ورنہ یہ بہت کثرت سے ہیں۔

''ح'' کے حوالے سے مندرجہ بالا تمام اختلاف ،نسخۂ عرشی میں درج ہیں لیکن وہاں حوالہ صرف ''ق'' کا ہے۔ اس کے ساتھ ''ح'' کو بھی درج کرنا چاہیے تھا کیونکہ ایسے متعد

Scanned by CamScanner

اختلاف کو "ق" اور "ح" دونوں کے حوالے سے درج بھی کیا ہوا ہے تو پھر ان کے ساتھ "ح" کا ذکر نہ کرنا، مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ جبکہ نسخۂ عرشی طبع اول میں، ان میں سے بعض کے اندراج میں "ق" کے ساتھ "ح" کا حوالہ بھی ہے۔ اس صورت میں طبع ثانی میں ان اختلاف کو درج کرتے ہوئے صرف "ق" حوالہ دینے اور "ح" کا نہ دینے سے خواہ مخواہ یہ گمان گزرتا ہے کہ "ح" سے استفادہ کیا گیا ہے لیکن اس کا حوالہ نہ دے کر اور صرف "ق" کا حوالہ دے "ق" کے مندرجات سے مکمل آگاہی کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔

نسخۂ عرشی طبع ثانی کا ایک دوسرے پہلو سے جائزہ لیں تو "ح" کے حوالے سے مرتب نسخۂ عرشی کے بارے میں، یہ گمان، یقین میں بدلتا نظر آتا ہے۔ مثلاً نسخۂ عرشی طبع اول کے "گنجینۂ معنی" میں "ق" اور "قا" کے مشترک کلام میں سے، بنیادی متن کے طور پر "ق" کے متن کو قبول کیا ہے (جو بڑی حد تک "ح" کے بھی مطابق ہے) اور "قا" کے اختلاف درج کیے ہیں۔ نسخۂ عرشی طبع ثانی کے "گنجینے" کا بنیادی متن "قا" کے متن کو رکھا ہے۔ ظاہر ہے "قا" کا متن جہاں "ق" کے مطابق نہیں ہے وہاں "ق" کا اختلاف درج کیا جائے گا۔ لیکن طبع ثانی کے "گنجینے" کے اختلاف نسخ کو دیکھیں تو وہ الفاظ جو طبع اول میں "ق" کے حوالے سے متن میں رکھے تھے، اب وہ "اختلاف نسخ" میں "ح" کے حوالے سے سہو کاتب قرار دیے جا رہے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اگر اب یہ تعین ہوا ہے کہ یہ سہو ہے تو "ق" کے کاتب کا ہونا چاہیے نہ کہ "ح" کے مرتب کا۔ طبع ثانی کا متن اگر "قا" کو قرار دیا ہے تو طبع اول میں جب یہ "ق" کا تھا تو اب اختلاف نسخ میں "ق" ہی کے حوالے سے اسے درج کرنا چاہیے خواہ وہ متن کا اختلاف ہے یا سہو کاتب۔ صرف چند مثالیں ملاحظہ ہوں، بات خود بخود واضح ہو جائے گی:

نسخۂ عرشی طبع اول: ۳:۱۲ب	نشہ و جلوۂ گل، بر سر ہم فتنہ عیار	
نسخۂ عرشی طبع ثانی: ۳:۱۲ب	نشہ و جلوۂ گل، بر سر ہم فتنہ غبار	ح، عیار (سہو کاتب)
نسخۂ عرشی طبع اول: ۸:۱۰ب	پر پرواز، مری بزم میں ہے خنجر کیں	

نسخۂ عرشی طبع ثانی: ۸۰۳ ب	پر پروانہ مری بزم میں ہے نحو کیں	ح: پروانہ (سہو کاتب)
نسخۂ عرشی طبع اول: ۹۰۳ ب	اس کے جلووں میں نظر آتے ہے جوں دامن دیں	
نسخۂ عرشی طبع ثانی: ۹۰۲ ب	اس کے جلووں میں نظر آتے ہے جوں دامن دیں	ح: دیں (سہو کاتب)
نسخۂ عرشی طبع اول: ۹۰۳ الف	اس کی شوخی سے، بہ حسرت کدۂ نقش خیال	
نسخۂ عرشی طبع ثانی: ۹۰۷ الف	اس کی شوخی سے، بہ حسرت کدۂ نقش خیال	ح: بہ حسرت کدۂ (سہو کاتب)

ایسی مثالیں صرف یہ نہیں ہیں۔ نسخۂ عرشی طبع ثانی کے گنجینے میں "ط" کے متن کو "ق" کی نسبت ترقی یافتہ ہونے کی صورت میں، متن میں درج کیا اور جہاں یہ متن "ق" کے مطابق نہیں اس میں سے تقریباً اسی فی صد کو "ح" کا سہو قرار دے دیا گیا ہے، اور جو الفاظ سہو کاتب نہیں بلکہ متن کا اختلاف تھا اس صورت میں انہیں اختلاف میں لیتے ہوئے "ق" کا حوالہ دیا ہے (جس کی مثالیں اس سے پہلے "ح" کے محذوف اختلاف نسخ کے تحت آچکی ہیں) یعنی اگر متن کا اختلاف ہے تو اُسے "ق" کے حوالے سے درج کیا ہے اور اگر سہو کاتب ہے تو اُسے مرتب "ح" کے سر ڈال دیا ہے۔

نسخۂ عرشی میں اختیار کیے جانے والے املا کے بارے میں، مولانا عرشی نے کسی ایک جگہ، املا کی جملہ تفصیلات درج نہیں کیں جس طرح کہ "مکاتیب غالب" کے مقدمے میں املائے غالب کا باب ہے۔ اس نوعیت کی کچھ معلومات، نسخۂ عرشی کے مقدمے اور کچھ "حواشی و اختلاف نسخ" میں بکھری پڑی ہیں جنھیں تلاشِ بسیار کے بعد ہی دیکھا جا سکتا ہے پھر بھی وہ مکمل نہیں ہوتیں۔ املائے غالب یا نسخۂ عرشی میں اپنائے جانے والے املا کے بارے میں مختلف مقامات پر بکھری ہوئی ان معلومات کو یک جا کر لیا جائے تب بھی اس سلسلے میں الجھنیں باقی رہ جاتی ہے۔ نسخۂ عرشی کے مقدمے میں ایک حصہ ایسا ہونا چاہیے تھا کہ جس میں غالب کے املا، مروجہ املا اور پھر نسخۂ عرشی میں اپنائے جانے والے املا کے بارے میں تفصیلات آجاتیں۔

Scanned by CamScanner

(مقدمے میں "کتابت اور رسم الخط" کے عنوان سے جو وضاحت ہے، وہ ناکافی ہے۔ اس کی تلافی کرنے کے لیے اگر "مکاتیبِ غالب" کے مقدمے کی طرف رجوع کیا جائے تو بھی کچھ مسائل حل طلب رہ جاتے ہیں۔ مثلاً "مکاتیبِ غالب" میں غالب کے کئی الفاظ کے املا پر گفتگو کی گئی ہے جو نسخۂ عرشی میں اس کے خلاف لکھا ہوا ملتا ہے، بلکہ بعض الفاظ کا تو "مکاتیب" میں بھی احاطہ نہیں ہو سکا۔

نسخۂ عرشی طبع ثانی میں املا کی دورنگی کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

۳۱۲: ۳، ب   کیا مزہ ہوتا، اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

۲۲۷: ۳، الف   غالب، مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو؟

ان دو مختلف مصرعوں میں ایک جگہ لفظ "مزہ" اور دوسری جگہ "مزا" آیا ہے۔ نسخۂ عرشی کے مقدمے، حواشی، اختلافِ نسخ، استدراک، یا صحت نامہ میں کہیں یہ وضاحت نہیں کہ اس لفظ کی یہ دو صورتیں کیوں رکھی گئی ہیں۔

نسخۂ عرشی طبع اول کی نسبت طبع ثانی میں، املا کی دورنگی کی مثالیں کم ہیں، لیکن ہیں ضرور۔ ذیل کے صفحات میں انہیں کا جائزہ لینا مقصود ہے۔ رشید حسن خاں نے اپنی کتاب "املائے غالب" (کراچی ۲۰۰۰ء) میں بڑی تفصیل کے ساتھ، غالب کے پسندیدہ املا کا احاطہ اور تجزیہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے غالب کے املا کے تعین کے لیے غالب کی اپنی تحریروں یا ان کے عکس کو ہی معتبر سمجھا اور ان کی بنیاد پر، غالب کے کلام نظم و نثر کی تدوین میں جہاں اس کے خلاف چلا گیا ہے، اُن کا بھی احاطہ کیا ہے۔ اس ذیل میں انہوں نے نسخۂ عرشی طبع اول کو سامنے رکھ کر بھی املا کی دورنگی کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں اور جہاں نسخۂ عرشی غالب کے املائے خلاف ہے اس کا بھی احاطہ کیا ہے۔ یہاں نسخۂ عرشی کے املا کا جائزہ لیتے ہوئے رشید حسن خاں کی کتاب "املائے غالب" سے بھی مدد لی گئی ہے لیکن جہاں ان کے مشاہدات یا معروضات کے برعکس ہیں وہاں دلائل کے ساتھ اختلاف کا سبب بیان کرنے کی کوشش کی گئی

Scanned by CamScanner

گئی ہے۔

نسخہ عرشی طبع اول کے املا سے رشید حسن خاں کو اختلاف کی زیادہ گنجائش دو سبب سے ہوئی ہے۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے نسخہ عرشی میں اپنائے جانے والے املا کے بارے میں مولانا عرشی کی ایک وضاحت کو نظر انداز کرتے ہوئے اصول تدوین کی پابندی کرنے کو زیادہ ضروری سمجھا ہے۔ دوسرا یہ کہ انہوں نے طبع ثانی کی نسبت طبع اول کو سامنے رکھا ہے جس میں املا کے اشکال زیادہ ہیں۔ رشید حسن خاں چونکہ منشائے مصنف کے مطابق تدوین کرنے اور کروانے کے قائل ہیں اس لحاظ سے، وہ املا بھی مصنف کی منشا کے مطابق رکھنے کو کہتے ہیں، جو اصول تدوین کے بھی مطابق ہے۔ غالب چونکہ بعض الفاظ کے املا کے بارے میں اپنی منفرد رائے رکھتے تھے اور اپنی تحریروں میں بھی اس کی پابندی کرتے تھے۔ اس لیے، جس طرح اصول تدوین کے مطابق متن کو منشائے مصنف کے مطابق پیش کرنا ہوتا ہے اس طرح املا کو بھی مصنف (خصوصاً غالب) کے منشا کے مطابق درج کرنا چاہیے۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو نسخہ عرشی طبع اول یا طبع ثانی دونوں میں غالب کے املا کی مکمل پیروی نہیں کی گئی جو اصول تدوین کے خلاف ہے۔

نسخہ عرشی میں تین طرح کے املا ملتے ہیں:

(ا) غالب کے املا کی پیروی:

نسخہ عرشی میں جن الفاظ کے سلسلے میں املائے غالب کی پیروی کی گئی ہے وہ تقریباً یہ ہیں: نظہ (طبع اول میں بغیر تشدید شین اور ہ پر ہمزہ کے اضافے سے تھا) پانو، (بجائے پاؤں) ،خرچ (بجائے خرچ) خرشید (بجائے خورشید)، لمبر (بجائے نمبر)۔ ان کے علاوہ غالب فارسی واردو الفاظ میں "ذ" لکھنا غلط قرار دیتے تھے اور اس کی جگہ "ز" لکھتے تھے۔ مثلاً زرا، گزر، رہگور، گزارش وغیرہ نسخہ عرشی میں یہ اور ان جیسے دیگر الفاظ غالب کے منشا کے مطابق ہی درج ہیں۔

"ذ" کی طرح غالب فارسی الفاظ میں "ط" کو غلط قرار دیتے تھے۔ نسخہ عرشی میں ان میں سے

Scanned by CamScanner

"گلشن ان"، "کمر"، "کھدن" کو ہر جگہ "ت" کے ساتھ لکھا ہے۔ ہائے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ کو حرف صورت میں، غالب "ے" کے ساتھ لکھتے تھے مثلاً رتبہ کو رتبے، کوچہ کو کوچے، زمانہ کو زمانے وغیرہ۔ نسخۂ عرشی میں اس کی بطور خاص پابندی کی گئی ہے اور ان کو املائے غالب کے مطابق لکھا گیا ہے۔

غالب کے املا کی پیروی کی یہ مثالیں تو وہ تھیں جن پر غالب اصرار کرتے تھے اور اس وقت یا آج بھی ان الفاظ کا یہ املا مروج نہیں ہے۔ اب کچھ ایسے الفاظ ملاحظہ ہوں جو غالب اور مروج املا دونوں کے مطابق ہیں۔ مثلاً آرائش، نمائش، فرمائش، آزمائش، ستائش وغیرہ ...... بادشاہ، پردہ، کچھ (پانچ مصرعوں ۱۸۳، ۹ ب، ۱۸۴، ا ب، ۱۹۲، ۲ ب، ۳۱۹، ۱ ب، اور ۳۲۳، ۲ ب، میں قافیے کی مجبوری سے "کچھ" آیا ہے) ...... حائل، جہت، عزت (بغیر الف پر ہمزہ) ...... پتا، ٹھنڈا، تماشا، سمجھا ...... مجھ، مجھے، تجھ، تجھے ...... پے، لے، دے (طبع اول میں مولانا عرشی نے یائے مجہول کی بجائے، یائے معروف (ی)) کے ساتھ لکھا تھا لیکن طبع ثانی میں ان اور ان جیسے دیگر الفاظ کو درست طور پر یائے مجہول سے لکھا ہے)۔

(ب)- غالب کے برعکس مروج املا و رسم الخط:

غالب: افگندن، شیر افگن ...... نسخۂ عرشی: افگندن، شیر افگن۔

غالب: پچتانا، پچتایا، پچتاے۔ ...... نسخۂ عرشی: پچھتانا، پچھتایا، پچھتاے۔

غالب: ترپھنا، ترپھتا، ترپھا۔ ...... نسخۂ عرشی: تڑپنا، تڑپتا، تڑپا۔

غالب: ٹھیرنا، ٹھیرو، ٹھیرا۔ ...... نسخۂ عرشی: ٹھہرنا، ٹھہرو، ٹھہرا۔

غالب: سونچ، سونچنا، سونچا ...... نسخۂ عرشی: سوچ، سوچنا، سوچا۔

غالب: مجکو، تجکو، مجسے تجسے ...... نسخۂ عرشی: مجھ کو، تجھ کو، مجھ سے، تجھ سے

ان الفاظ میں غالب کے املا اور رسم الخط کا تعین، "مکاتیب غالب" کے مقدمے میں "املائے غالب" سے اور رشید حسن خاں کی کتاب "املائے غالب" سے کیا ہے کہ غالب مندرجہ

Scanned by CamScanner

بالا الفاظ کو اس طرح لکھتے تھے اور نسخہ عرشی میں ان کو مروج صورت میں لکھا گیا ہے۔

نسخہ عرشی میں پائے جانے والے متذکرہ بالا دو طرح کے املا اصول تدوین کے خلاف ہیں۔ ان میں سے دوسری صورت کو بھی املائے غالب کے مطابق درج کرنا چاہیے تھا، لیکن نسخہ عرشی کی ترتیب و تدوین میں مولانا عرشی نے جو بات پیش نظر رکھی ہے اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ مقدمے میں "املا اور رسم الخط" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"اس نسخے (نسخہ عرشی) کی کتابت میں موجودہ اصول اور میرزا صاحب کی پسندیدگی دونوں کا لحاظ رکھا گیا ہے" (مقدمہ، ص ۱۵۸)

یعنی مولانا عرشی نے نسخہ عرشی کو املا اور رسم الخط کے لحاظ سے موجودہ دور کی مروج صورتوں کے بھی مطابق رکھنے کی کوشش کی ہے اور غالب کی املائی ترجیحات اور مختارات کا جائزہ بھی دینا چاہا ہے۔ اس دوہرے اصول کا مقصد صرف یہ نظر آتا ہے کہ مولانا عرشی نے اسے طبقہ خاص و عام میں یکساں مقبول کرنے کے لیے ایسا کیا ہے۔

(ج) - نسخہ عرشی میں املا کی دورنگی کی مثالیں:

نسخہ عرشی میں املا اور رسم الخط کی مذکورہ بالا دو صورتوں کے علاوہ ایک تیسری صورت، بعض الفاظ میں املا کی دورنگی ہے، جو زیادہ محل نظر ہے کیونکہ الفاظ کی یہ صورت، کہیں املائے غالب کے مطابق ہے اور کہیں موجودہ دور کے مطابق اور یہ دورنگی، خود مولانا عرشی کے اختیار کردہ اصول کے بھی خلاف ہے۔ یعنی ایک ہی لفظ مختلف مصرعوں میں، دو صورتوں میں لکھا ملتا ہے۔ اصولاً اسے یا تو غالب کے املا کے مطابق ہونا چاہیے یا پھر مروج صورت میں۔ ذیل میں نسخہ عرشی میں سے بعض الفاظ کے املا کی دورنگی کو زیر بحث لاتے ہوئے، رشید حسن خاں کے بھی کچھ مشاہدات کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

آئینہ، آئنہ:

نسخہ عرشی طبع اول میں آنے والے اس لفظ کے بارے میں رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

”مقدمۂ مکاتیبِ غالب میں عرشی صاحب نے لکھا ہے ”لفظ آئینہ جب فاعلن کے وزن پر باندھا جاتا ہے تو اسے ”آینہ“ لکھا ہے ”آئینہ“ نہیں لکھا اور یہی املا ہم کو بتاتا ہے۔ ... دوسری طرف خود عرشی صاحب نے نسخۂ عرشی میں ہر جگہ ”آئنہ“ لکھا ہے۔ اس نسخے کے شروع کے دس صفحات کا جو میں نے جائزہ لیا، تو ان میں یہ لفظ گیارہ مصرعوں میں آیا ہے اور ہر جگہ ”آئنہ“ لکھا ہوا ہے“۔ (املاے غالب، ص ۳۳-۳۴)

نسخۂ عرشی طبع اول کے متن کے ان پہلے دس صفحات کا جائزہ لیا گیا تو لفظ ”آئنہ“ بار اور ”آئے“ دو بار آیا ہے۔ اسی طرح ابھی پہلے دس صفحات میں ”آئینہ“ گیارہ مرتبہ اور ایک مرتبہ ”آئیے“ بھی آیا ہے۔ یعنی ایسا نہیں کہ ”ہر جگہ آئنہ“ ہی لکھا ہے بلکہ گیارہ مرتبہ ”آئنہ“ بغیر ”ی“ کے اور بارہ مرتبہ ”آئینہ“، ”ی“ سے پہلے ہمزہ کے ساتھ آیا ہے۔ اس لفظ کی یہ دونوں صورتیں، نسخۂ عرشی طبع اول اور طبع ثانی، دونوں میں ایک خاص قاعدے کے ساتھ درج ہوئی ہیں ایسا نہیں کہ ”ہر جگہ آئنہ“ بغیر ”ی“ کے آیا ہو۔

مولانا عرشی نے اس لفظ کی یہ دونوں صورتیں شعر کے وزن کے لحاظ سے رکھی ہیں یعنی جہاں اس لفظ میں ”ی“ ساقط ہے، وہاں مولانا عرشی نے اسے بغیر ”ی“ کے ”آئنہ“ لکھا ہے اور دوسری صورت میں جب یہ فاعلن کے وزن پر آیا ہے تو ”ی“ کے ساتھ ”آئینہ“ لکھا ہے۔ ذیل میں اس لفظ کی دونوں صورتوں کی دو دو مثالیں ملاحظہ ہوں، جو نسخۂ عرشی طبع اول اور طبع ثانی میں ایک جیسی ہیں۔ چونکہ رشید حسن خاں کا اعتراض نسخۂ عرشی طبع اول پر ہے۔ اس لیے ذیل میں یہ مثالیں طبع اول سے دی جا رہی ہیں۔

۳۳ الف ہواے سیرِ گل، آئینۂ بے مہریِ قاتل

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

ہواے نیکیِ رنگِ گل آرائی

[illegible]

بحر مضارع: آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے	مفعول	فاعلات	مفاعیل	فاعلن
	آ ای ن	دے ک اپ ن س	منہ لے ک ر	ہ گ ئے
بحر متقارب: بغیر آئے کو طوطی بھی باندھا	فعولن	فعولن	فعولن	فعلن
	رگ گر سے آ	ئے کو طو	طی بھی	باندھا
بحر مضارع: تو وہ بدخو ہے آئے جو تماشا دار تھا	مفعول	فاعلات	مفاعیل	فاعلن
	تو ذو بد	خو ہے آ	ئے جو تما	دار تھا

ان مثالوں اور اس کے علاوہ، اس طرح کی تمام مثالوں کے تعین اور جائزے کے لیے، ہیلیر النساء بیگم کی کتاب ''غزلیات غالب کا عروضی تجزیہ''[۳] سے بھی مدد لی گئی ہے، جس میں انہوں نے اس لفظ کی ان دونوں صورتوں کے اس فرق کو ملحوظ رکھا ہے۔

ان الفاظ کی یہ وہی صورتیں ہیں جس طرح لفظ ''میری'' میں میم کے بعد والی ''ی'' ساقط ہو تو اسے بغیر پہلی ''ی'' کے ''مری'' لکھا جاتا ہے۔ مولانا عرشی نے شعر کے بحر و وزن کے فرق کو ظاہر کرنے اور تقطیع کرنے والے کے لیے آسانی کی خاطر، جو قاعدہ ''آئینہ'' اور ''آئنہ'' کے املا میں برقرار رکھا ہے وہ ذیل کے الفاظ میں بھی اپنایا ہے، مثلاً میرا، میری، میرے، تیرا، تیری، تیرے میں، جہاں پہلی ''ی'' ساقط ہے وہاں ان تمام کو بغیر ''ی'' کے مرا، مری، مرے اور ترا، تری، ترے لکھا ہے۔ ظاہر ہے مولانا عرشی اگر یہ اہتمام نہ کرتے تو پھر ماہرین عروض نے معترض ہونا تھا۔

تراز (طراز):

''تراز'' فارسی لفظ ''ترازیدن'' سے مشتق ہے۔ اس کی معرب صورت ''طراز'' اُردو میں رائج ہے۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں: ''مرزا صاحب نے پنج آہنگ میں وضاحتاً لکھا ہے کہ ''ترازیدن'' کے مشتقات میں ط نہیں لکھنا چاہیے''۔ (املائے غالب، ص: ۶۷)

نسخۂ عرشی میں، اس لفظ کے سلسلے میں، غالب کی اس تاکید کے برعکس، اردو کی مروج

Scanned by CamScanner

صورت "طراز" وغیرہ ملتی ہے مثلاً: "طوفان طرازِ شوقِ خوں ریزی" (۳۲: ۷، الف)، "شوخیِ حسن طرازی" (۲۸: ۱۲، ۱۰ ب)، "طرازِ دوام" (۱۵۵: ۸ ب)، "مدحت طرازی" (۱۵۷: ۱۲، الف)، "چمن طرازیِ داماں" (۲۹۵: ۹ ب)، "شاطرازی ہے" (۳۸۲: ۱۷، الف)، "سحر طرازی" (۳۱: ۷ ب)۔ یہ تمام حوالے نسخۂ عرشی طبع ثانی کے ہیں جن میں مولانا عرشی نے اس لفظ کے مروج املا کو ملحوظ رکھا ہے لیکن ایک جگہ اس کے برعکس بھی نظر آیا ہے:

۱۷۱: ۸، الف — شوق، ہے ساماں ترازِ نازشِ اربابِ عجز

اس مصرعے میں "ترازِ نازش" کا اختلافِ نسخ دیتے ہوئے لکھا ہے:

"ق، قا، گل، قیام، طراز"، یعنی مولانا عرشی نے یہاں ان پانچ نسخوں میں "طراز" پر "تراز" کو ترجیح دی اور اسے متن میں جگہ دی جو غالب کے املا کے مطابق مگر مروج کے برعکس ہے۔ چونکہ اس لفظ کے املا میں، اس ایک کے علاوہ تمام جگہ مروج صورت میں "ط" کے ساتھ لکھا ہے اس لیے، ان کے اس اصول کے مطابق یہاں بھی "طراز" آنا چاہیے تھا یا پھر تمام جگہ غالب کے مطابق ہونا چاہیے تھا۔ نسخۂ عرشی طبع اول میں بھی صرف ایک جگہ اسی مصرعے میں "تراز" ہے باقی تمام جگہ "طراز" ہی ہے۔

ڈُکان (دوکان):

اس لفظ کے بارے میں رشید حسن خاں، غالب کی وضاحت کے مطابق لکھتے ہیں:

"یہ بات واضح ہو جانا چاہیے کہ یہ لفظ جن شعروں میں بروزنِ مفعول نظم ہوا ہو، اُن اشعار میں اسے اصل کے مطابق مع کافِ مشدّد (دُکّان) لکھا جانا چاہیے۔ "دوکان" نہیں لکھنا چاہیے"۔

(املاے غالب، ص: ۹۰)

رشید حسن خاں نے نسخۂ عرشی طبع اول میں سے چار مصرعوں میں اس لفظ کے استعمال کی نشاندہی کی ہے۔ ان میں سے دو جگہ درست طور پر "دکان" ہی ہے مگر دو مصرعوں میں "دوکان" چھپا ہے۔ نسخۂ عرشی طبع ثانی کے متن میں بھی ان دو مصرعوں میں یہ اسی طرح چھپ گیا ہے۔

۲۱، ۹، الف   خانمانِ عاشقاں دوکان آتشباز ہے

۹۷، ۵، ب   اب چار سوئے عشق سے دوکاں اٹھائیے

ان میں سے پہلے مصرعے میں "صحت نامہ" کے تحت "دکان" بنا لینے کے لیے کہا ہے لیکن دوسرا مصرع متن میں ایسے ہی رہ گیا ہے۔ "صحت نامہ" میں بھی اس کی تصحیح نہیں ہو سکی۔ اسے سہو نظری سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ ایک جگہ "دکان" بنا لینے کا مطلب یہ ہے کہ دوسری جگہ بھی مرتب اسی طرح چاہتے ہیں۔

کسی (کسو):

دیوان غالب کا تیسرا ایڈیشن ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے کاتب نے تقریباً ہر جگہ "کسی" کو "کسو" لکھا تھا۔ غالب نے اس کے آخر میں "عبارت خاتمۂ دیوان" کے تحت لکھا کہ کاتب کی غلطیوں کی اصلاح کر دی ہے مگر:

> "ایک لفظ میری منطق کے خلاف، نہ ایک جگہ بلکہ سو جگہ چھاپا گیا ہے۔ کہاں تک بدلتا؟ ناچار یونہی چھوڑ دیا، یعنی، کسو، بکاف مکسور و سین مضموم و واو معروف۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں۔ البتہ فصیح نہیں۔ قافیے کی رعایت سے اگر لکھا جائے، تو عیب نہیں، ورنہ فصیح بلکہ افصح "کسی" ہے، واو کی جگہ یائے تحتانی۔" (بحوالہ، مقدمہ، ص: ۱۳۸)

یعنی پہلے غالب "کسو" ہی لکھا کرتے تھے۔ "مگر بعد میں جدید محاورے کے ماتحت "کسی" بنایا ہے"۔ اس کے علاوہ، نسخۂ عرشی میں، نسخۂ رام پور جدید (۱۸۵۵ء) کے حوالے سے

Scanned by CamScanner

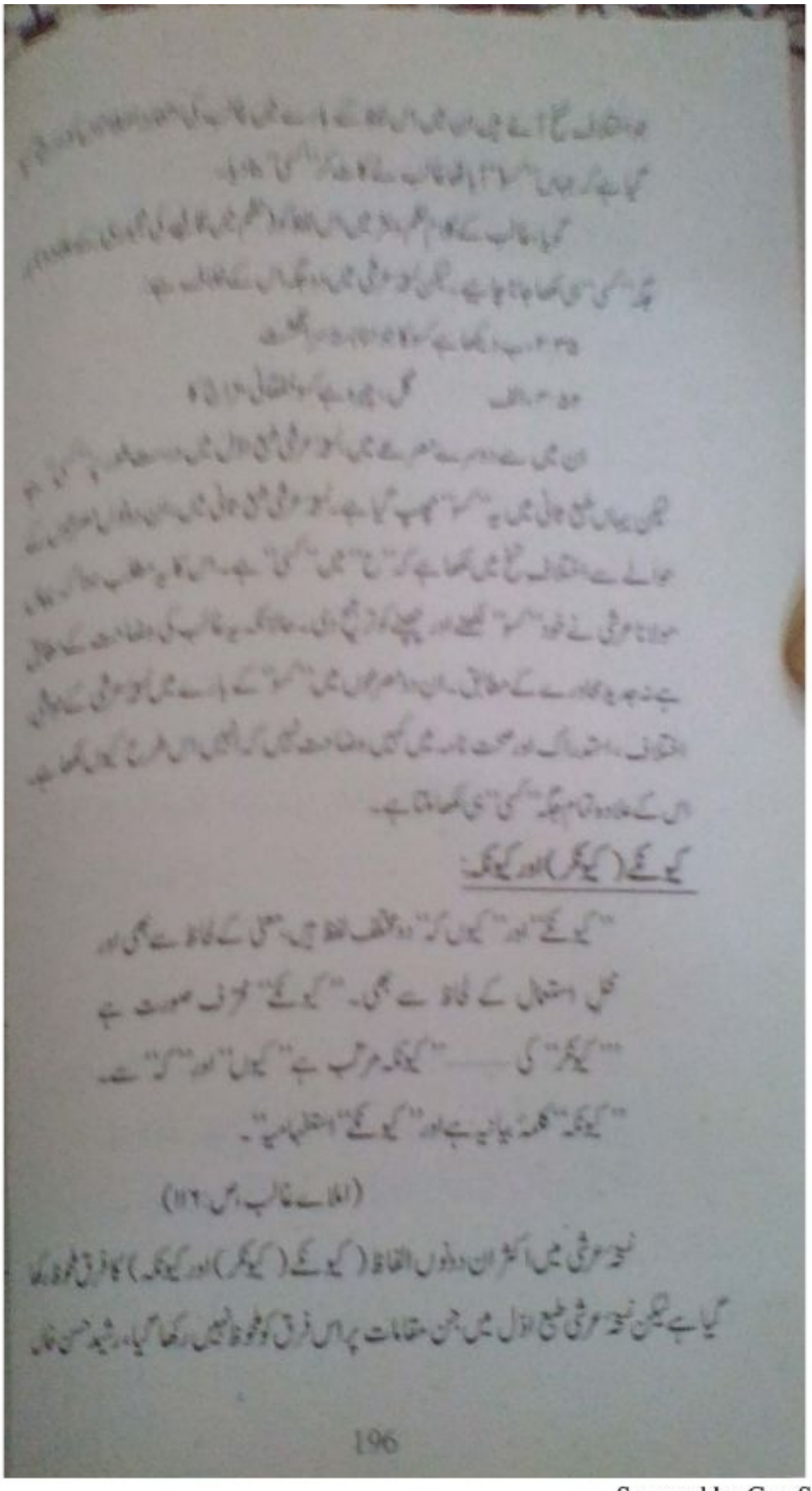

جو اختلاف نسخ آئے ہیں ان میں اس لفظ کے بارے میں غالب کی [illegible]

گیا ہے کہ [illegible] "کہی" [illegible] غالب کے [illegible] "کی" [illegible]

گویا غالب کے کلام [illegible] میں اس لفظ [illegible]

جگہ "کہی" ہی لکھا جانا چاہیے۔ لیکن نسخۂ عرشی میں دو جگہ اس کے خلاف ہے۔

[illegible]

[illegible] گی [illegible]

ان میں سے دو مصرعے ایسے ہیں جو نسخۂ عرشی طبع اول میں [illegible] لیکن یہاں عرشی طبع اول میں "کہی" چھپ گیا ہے۔ نسخۂ عرشی طبع اول میں ان دونوں مصرعوں کے حوالے سے اختلاف نسخ میں لکھا ہے کہ "نسخ میں "کی" ہے۔" [illegible] مولانا عرشی نے خود "کہی" لکھے اور چھپے کو ترجیح دی۔ [illegible] غالب کی [illegible] کے مطابق [illegible] ان دو مصرعوں میں "کہی" کے بارے میں نسخۂ عرشی کے [illegible] اختلاف [illegible] اور صحت متن میں [illegible] اس طرح [illegible] لکھا ہے۔ اس کے علاوہ دو جگہ "کہی" ہی لکھا جاتا ہے۔

کیونکے (کیونکر) اور کیونکہ:

"کیونکے اور کیوں کر دو مختلف لفظ ہیں، معنی کے لحاظ سے بھی اور محل استعمال کے لحاظ سے بھی۔ "کیونکے" محرف صورت ہے "کیونکر" کی .... "کیونکہ" مرکب ہے "کیوں" اور "کہ" سے۔ "کیونکہ" کلمۂ بیانیہ ہے اور "کیونکے" استفہامیہ۔"

(املائے غالب، ص: ۱۱۶)

نسخۂ عرشی میں اکثر ان دونوں الفاظ (کیونکے (کیونکر) اور کیونکہ) کا فرق ملحوظ رکھا گیا ہے لیکن نسخۂ عرشی طبع اول میں جن مقامات پر اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا، رشید حسن خاں

Scanned by CamScanner

لیے پانچ مصرعوں کی نشاندہی کی ہے۔ طبع ثانی میں انھیں تلاش کیا تو متن میں سے پانچ ایسے مصرعے دریافت ہو سکے ہیں جن میں ان میں "کیونکہ" (یا کیوں کر) کی شکل ہے، وہاں "کیونکہ" چھپ گیا ہے۔ طبع ثانی سے یہ پانچ مثالیں ملاحظہ ہوں:

۸۲: ۱۲۹، ب — چھپاؤں کیونکہ غالب سوزشیں داغِ نمایاں کی

۱۰۹: ۷، الف — نہ دو دے کیونکہ اسے فرضِ قتلِ اہلِ وفا

۲۱۸: ۱، الف — جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی؟

۲۷۴: ۳، الف — نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی

۳۲۵: ۳، الف — اٹھائے کیونکہ یہ رنجورِ رشتۂ آں نگہ

ان میں سے دوسرے اور تیسرے مصرعے میں "صحت نامہ" کے تحت "کیونکہ" کو "کیوں کے" میں تبدیل کر لینے کی ہدایت ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ باقی تین سہو درست کر لینے یا کروانے سے رہ گئے ہیں۔ انھیں تلاش ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن صحیح کا یہ احساس صرف طبع ثانی میں ہے طبع اول میں کہیں مذکور نہیں ہے۔

مزا/مزہ:

رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

> "مرزا صاحب کے کلام میں اُن کی تحریر کے مطابق "مزا" ہی لکھا جانا چاہیے۔ عرشی صاحب نے نسخۂ عرشی (طبع اوّل) میں "مزا" ہی لکھا ہے۔" (املاے غالب، ص: ۱۳۲)

رشید حسن خاں نے مثال کے لیے نسخۂ عرشی طبع اوّل میں سے چار اشعار نقل کیے ہیں جن میں "مزا" ہی ہے۔ طبع ثانی میں سے اس لفظ کے استعمال والے ۹ مصرعے تلاش کیے جا سکتے ہیں جن میں سے دو میں "مزہ" (الف کی بجائے ہ کے ساتھ) چھپا ہوا ہے:

۲: ۲۱۲، ب — کیا مزہ ہوتا، اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

Scanned by CamScanner

مژہ تو جب ہے کہ گرا ہے آ ؤ نا دیدہ ہم سے

۳۳۰ : ۱ ، الف

ان میں سے پہلے مصرعہ میں، نسخۂ عرشی طبع اوّل میں درست طور پر ''مژہ'' ہی لکھا ہے لیکن طبع ثانی میں یہ ''مزہ'' بن گیا ہے۔ دوسرا مصرع طبع ثانی کا اضافہ ہے۔ جس میں ''مزہ'' لکھا ہے۔ ان دو کے علاوہ باقی سات مصرعوں (۱۶۲ : ۱ ، الف ، ۶ ، ب ، ۱۹۳ : ۲ ، ب ، ۲۴۷ : ۲ ، الف ، ۳۰۸ : ۴ ، ب ، ۹ ، الف ، ۳۱۸ : ۳ ، الف) میں درست طور پر ''مژہ'' ہی ہے۔ گویا صرف بالا دو مصرعوں میں سہواً ''مزہ'' چھپ گیا ہے جس کی تصحیح ''صحت نامہ'' میں بھی نہیں ہوئی۔

ناچار (لاچار):

نسخۂ عرشی طبع اوّل کے صفحہ ۵۵ پر غزل نمبر ۱۱۳ کا مقطع ہے

اسدؔ، شکوہ کفر، دعا ناسپاسی
ہجومِ تمنا سے ناچار ہیں ہم

''اختلافِ نسخ'' کے تحت۔ اس مقطع کے حوالے سے لکھا ہے:

''ق، ۵، لاچار۔ آخر میں غالب نے ناچار لکھنا شروع کر دیا تھا اور ''لاچار'' کو غلطِ محض قرار دے دیا تھا (مکاتیب غالب ۹۴، طبع چہارم) اس لیے متن میں ''ناچار'' لکھا گیا ہے۔''

(نسخۂ عرشی، طبع اوّل، ص: ۲۰۹، کالم: ۱)

مولانا عرشی کی یہ رائے: ''مکاتیب غالب'' کے متن کے صفحہ ۹۴ پر، بیتابؔ رام پوری کے کلام پر غالب کی اصلاح پر مبنی ہے۔ ''مکاتیب'' (متن، ص: ۸۸) کے مطابق بیتابؔ ۱۸۶۶ء میں غالب کے شاگرد ہوئے اور اصلاح لینا شروع کی۔ گویا مولانا عرشی کے مطابق، غالب کا، ''لاچار'' کو غلطِ محض اور ''ناچار'' کو درست کہنا ۱۸۶۶ء کے بعد ہی کا ہوگا۔

مولانا عرشی نے نسخۂ عرشی طبع اوّل میں، اس لفظ کو بھی کچھ دوسرے الفاظ کی طرح غالب کی آخری اصلاح کے مطابق ''ناچار'' لکھا ہے۔ جس پر رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''مرزا صاحب نے منقولۂ بالا مقطعے میں ''لاچار'' کو خود نہیں بدلا، اُسے

Scanned by CamScanner

مرتب (عرشی) نے بدلا ہے اور کسی مرتب کو (وہ استاد معظم عرشی صاحب کیوں نہ ہوں) یہ حق حاصل نہیں کہ وہ متن میں از خود کسی لفظ کو بدل دے۔"

(املائے غالب، ص ۱۴۳)

رشید حسن خاں کے بیان کردہ، تدوین متن کے اس مسلمہ اصول سے انحراف یا انکار ممکن نہیں لیکن کہنے کی بات یہ ہے کہ "ق" یا "قا" خود غالب نے اپنے قلم سے نہیں لکھے ہوئے جو ان کی پیروی میں، اب بھی "لاچار" لکھنے پر اتنا اصرار کیا جائے۔ البتہ یہ دونوں نسخے غالب کی نظر سے گزرے اور انہوں نے نظر ثانی کے وقت ان پر اصلاحیں بھی کی ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ اصلاحیں زیادہ سے زیادہ ۱۸۲۶ء سے پہلے ہی کی ہیں اور غالب نے "لاچار" کو "غلط محض" اس کے بعد کسی وقت قرار دیا ہوگا۔ اس سلسلے میں نسخۂ شیرانی (قا) سے ایک شہادت ملاحظہ ہو:

ناچار بے کسی کی بھی حسرت اٹھائیے۔

(عکسی اشاعت نسخۂ شیرانی، ورق ۵۸ ب)

اگر محولا بالا پہلے مقطعے میں، کاتب کے لکھے ہوئے نسخۂ شیرانی میں غالب نے، نظر ثانی کے وقت "لاچار" کو اسی طرح رہنے دیا ہے، تو اسی کاتب کے لکھے ہوئے اسی نسخے میں، اس دوسری جگہ "ناچار" کو بھی تو اسی طرح رہنے دیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ "قا" کی کتابت (۱۸۲۶ء) تک غالب کے نزدیک "لاچار" یا "ناچار" میں کوئی فرق نہ ہوگا (کیونکہ یہ دونوں اس وقت بھی اور آج بھی مستعمل ہیں)۔

ایک ضمنی شہادت کہ "ہجوم تمنا سے لاچار ہیں"، بیاض غالب بخط غالب (عکسی اشاعت، نقوش، غالب نمبر ۲، ص ۱۴۸) میں بھی موجود ہے اور وہاں اس میں "لاچار" ہی لکھا ہے۔ اس شہادت سے اس خیال کو مزید تقویت ملتی ہے کہ شروع میں، غالب "لاچار" بھی لکھتے تھے، جسے بعد میں "غلط محض" قرار دے کر "ناچار" کو درست کہا اور لکھا۔ اس لحاظ سے مولانا عرشی نے اس لفظ کو غالب کی آخری اصلاح کے مطابق متن میں "ناچار" لکھا ہے تو درست ہے

Scanned by CamScanner

کیونکہ مقدمے میں مستحضر کی ترمیم، اصلاح پر املا کو اہمیت دی جاتی ہے۔ (جیسا کہ خلیق انجم
خاں نے دیوان میں غالب املا غالب (۱۸۶۹ء) کو انتہائی تحریر سمجھ کر اپنی کتاب "املائے غالب"
(ص ۲۰) میں۔ املا کے تعین کے لیے حوالہ نہیں بنایا)

رشید حسن خاں نے، مولانا عرشی کی نقل کردہ، بیتاب کے شعر پر غالب کی اصلاح کے استناد پر اظہار رائے نہیں فرمایا، گویا غالب کے قلم سے لکھے ہوئے "ناچار" پر جو رائے لکھی ہے "ق" اور "چ" میں کاتب کے لکھے ہوئے "لاچار" کو اپنا لینے پر اصرار کیا ہے جو درست نہیں۔

اس لفظ کے بارے میں، بحث کا ایک دوسرا پہلو کہ غالب نے کب سے "لاچار" کو غلط اور "ناچار" کو درست قرار دیا۔ مولانا عرشی نے بیتاب کے شعر پر اصلاح کا حوالہ دیا ہے۔ پہلے مذکور ہوا کہ بیتاب ۱۸۶۶ء میں غالب کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے گویا ان کے شعر پر زیر بحث اصلاح ۱۸۶۶ء یا اس کے بعد کی ہے۔ رشید حسن خاں نے "املائے غالب" میں زیادہ تر غالب کی قلمی تحریروں کی بنیاد پر ہی الفاظ کے املا کا تعین کیا ہے اور ان میں سے بھی غالب کی آخری ترمیم و اصلاح کو اہمیت دی ہے۔ لیکن زیر بحث لفظ کی دونوں صورتوں "لاچار" اور "ناچار" کے املا کے تعین میں، انہوں نے غالب کی کسی ایک بھی قلمی (یا عکسی) تحریر کا حوالہ نہیں دیا۔

نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں کے نام غالب کے قلمی خطوط کے عکس، پرتھوی چندر کی کتاب "مرقع غالب"[۲۷] اور "غالب کے خطوط" (جلد سوم)[۲۸] مرتبہ خلیق انجم، میں شامل ہیں، جو ۱۸۵۷ء کے بعد غالب کی وفات تک کے محررہ ہیں۔ ان میں متعدد بار لفظ "ناچار" آیا ہے۔ پہلی بار، نواب یوسف علی خاں کے نام ۱۸-اپریل ۱۸۵۹ء کے خط میں ہے:

"ناچار پہلے خط کا مضمون اس ورق میں مکرر لکھ دیا"

(مرقع غالب، ص: ۲۳۴، غالب کے خطوط (جلد سوم) ص: ۱۲۶۷)

Scanned by CamScanner

اس کے بعد بھی نوابان رام پور کے نام ان خطوط میں "مرقع غالب" کے صفحہ ۲۲۶، ۲۸۷، ۲۹۰، ۳۰۳، ۳۰۴ اور ۳۰۹ پر لفظ "ناچار" ہی لکھا ہوا موجود ہے۔ ان میں سے آخری خط جس میں یہ لفظ دو بار آیا ہے، نواب کلب علی خاں کے نام، ۱۶ نومبر ۱۸۶۸ء کا مرقومہ ہے:

"آج ناچار از روے اضطرار و اضطرار"

(مرقع غالب، ص ۳۰۹، غالب کے خطوط (جلد سوم) ص ۱۳۰۷)

"ناچار حسین علی کی شادی اور اس کے نام کی تنخواہ" (ایضاً، ایضاً)

ان مثالوں کے پیش نظر، غالب کے قلم سے لکھے ہوئے، اس لفظ کے آخری املا "ناچار" کو نظر انداز کر کے، "ق" اور "قا" میں کسی کاتب کے قلم سے "لاچار" کو غالب کے متن میں درج کرنے پر اصرار، قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

اب بھی اگر یہ اصرار ہو کہ غالب نے اگر پہلے "لاچار" لکھا ہے تو متن میں اس جگہ یہی لکھا جائے اور اس کے بعد اگر "ناچار" لکھنے لگے تو بعد والے اشعار میں "ناچار" لکھا جائے تو پھر وہ تمام الفاظ جو ابتدا میں غالب کسی اور طرح لکھتے تھے لیکن بعد میں کسی اور طرح لکھنے لگے اُن کا املا کیا ہوگا مثلاً "بیاض غالب بخط غالب" میں، غالب نے خود فارسی اور اُردو الفاظ میں "ذ" اور "ظ" لکھا ہے، لیکن بعد میں ایسے الفاظ کو پابندی کے ساتھ "ز" اور "ت" کے ساتھ لکھنے کے لیے کہا بھی اور لکھا بھی۔ کیا اس طرح کرنے سے املا کی دورنگی کی صورت پیدا نہ ہوگی جس سے، رشید حسن خاں، غالب کے کلام نظم و نثر کو بچانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے "املاے غالب" اسی مقصد کے لیے لکھی ہے کہ غالب کے "کلام نظم و نثر کے مختلف مجموعوں میں لفظوں کے املا میں دورنگی نمود حاصل نہ کر سکے"۔ (املاے غالب، ص: ۱۰)

رشید حسن خاں نے نسخۂ عرشی طبع اوّل میں سے "ناچار" کے محل کے منقولا بالا دو شعر ہی نقل کیے۔ جن میں سے ایک میں "لاچار" لکھنے پر اصرار کیا۔ مزید تلاش کیا تو طبع اوّل میں ان دو کے علاوہ مزید چار اشعار (۱۲۸: ۱۳، ۱۳۰: ۹، ۱۹۵: ۷ اور ۲۰۱: ۳) ایسے مل گئے جن میں

Scanned by CamScanner

[illegible]

"ہا" کو علیحدہ لکھنا

"ہا" کو علیحدہ لکھنے کے طور پر جب ایسے الفاظ میں آئے جن کے آخر میں [illegible] ہو تو انہیں الگ لکھا جاتا ہے مثلاً [illegible] ہا، [illegible] ہا وغیرہ۔ نسخۂ عرشی طبع اول و طبع دوم [illegible] میں اسی [illegible] کیا گیا ہے اور انہیں منفصل لکھا ہے کیونکہ مولانا عرشی کے مطابق [illegible] پھر بعد میں اسی طرح [illegible] اور یہاں کاتب سے [illegible] غالب نے تصحیح کر دی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ "ہا" جب ایسے الفاظ میں آئے جن کے آخری حروف منفصل ہوتے ہیں تو لازمی طور پر انہیں الگ ہی لکھا جائے گا مثلاً [illegible] ہا، گفتگو وغیرہ۔ نسخۂ عرشی میں اس کی بھی پابندی کی گئی ہے۔

اس علامت کی تیسری صورت یہ ہے کہ جب یہ ("ہا") ایسے الفاظ کے ساتھ آئے جنہیں ملا کر لکھا جا سکتا ہے وہاں بھی لازمی طور پر انہیں الگ لکھا جانا چاہیے۔ رشید حسن خاں صاحب کی قلمی تحریروں سے کئی مثالیں درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

"ان مثالوں کے پیش نظر یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مرزا صاحب نے اپنے قلم سے ایسے مرکبات میں بیشتر "ہا" کو منفصل لکھا ہے۔ نسخۂ عرشی میں ایسے مرکبات میں عموماً "ہا" کو ملا کر لکھا گیا ہے۔"

(املائے غالب، ص ۱۸۲)

Scanned by CamScanner

رشید حسن خاں نے نسخۂ عرشی طبع اول کے حوالے سے لکھا تھا لیکن طبع ثانی میں بھی ایسے مرکبات کی یہی صورت ہے مثلاً لکھا ہے خار (۳:۴) ربا (۸:۶) اور انیہا ہے (۴:۱۲) یہ لیاہے (۴:۱۹) ستھاہے (۱۴:۱۹) چمن بالیدہ نیہا ہے (۲:۳۴) اٹھاتھا ہے (۸:۳۲) جزاجھاہے (۱۰:۳۲) نسخۂ عرشی طبع ثانی کے ''گنجینے'' کے صفحہ ۲۴ اور ۲۵ پر غزل نمبر ۳۷، ۳۸، ۳۹ میں قافیہ ہی ایسا ہے۔ ھلکھیا، ھلکسیا، خسیا، وغیرہ۔ غرض یہ کہ طبع ثانی میں ایسے الفاظ کو کسی ایک جگہ بھی منفصل نہیں لکھا گیا۔ چونکہ یہ غالب کی روش کے بھی خلاف ہے اور مروج صورت بھی یہ نہیں لہٰذا انہیں ہر جگہ الگ الگ لکھا جانا چاہیے تھا۔

نسخۂ عرشی طبع اول میں قدیم روش کے مطابق الفاظ کو اکثر ملا کر لکھا گیا ہے۔ طبع ثانی میں طبع اول کی نسبت ملا کر لکھے جانے والے الفاظ کم ہیں لیکن ہیں ضرور مثلاً جہدِ حق (۱۰:۸۲) بزم (۵:۹۱) بکھیاہے (۹:۹۱) ہمعشقی رقیباں (۳:۱۰۱) برعمرِ دو عالم (۱:۱۰۲) وغیرہ۔ ان کے علاوہ ''نہ'' اور ''بہ'' کو بھی اکثر ملا کر لکھا ہے مثلاً نپوچھ (۳:۱۹۸) نرہا (۳:۱۹۹) نمانگ (۲،۱:۲۱۴) بحال (۹:۲۱۵) نچاہ (۵:۲۱۸) نہو (۷:۲۱۸) وغیرہ۔ جب نسخۂ عرشی میں کہیں کہیں ایسے الفاظ کو الگ الگ بھی لکھا ہے تو پھر یہاں اور ایسی مزید جگہوں پر ملا کر کیوں لکھا گیا ہے۔ ان کے اندراج کی ایک ہی صورت رہنا چاہیے تھی اور وہ ہے الگ الگ، نہ پوچھ، نہ رہا، نہ کر، نہ ہو وغیرہ جو زیادہ بہتر اور مروج بھی ہے۔

نسخۂ عرشی طبع اول کی نسبت طبع ثانی میں ایک نئی اور عجیب بات یہ نظر آتی ہے کہ اس کے اختلافِ نسخ میں مولانا عرشی نے اپنی وضاحتوں اور عبارتوں میں بیشتر جگہ الفاظ کو اعراب بالحروف لکھا ہے مثلاً:

''ح میں اس کی جگہ اوس شعر کو حاشیے کا بتایا ہے جو..........'' (نسخۂ عرشی، ص: ۲۲۳)

''مرتب ح نے اسے اون غزلوں کے ساتھ چھاپا ہے جن کا..........'' (نسخۂ عرشی، ص: ۱۸۰)

''مرتب ح نے اسے اون غزلوں کے زمرے میں جگہ دی ہے..........'' (ایضاً)

Scanned by CamScanner

"پھر بھی اپنے نسخے میں اسے اونہیں فرلوں کے ساتھ چھاپا ہے۔" (نسخہ عرشی، ص ۱۸۱)

ایسی اور بھی مثالیں ہیں اور یہ صرف طبع ثانی کے "اختلاف نسخ" میں آئی ہیں، اس کے علاوہ کہیں نہیں۔

نسخۂ عرشی میں املا کے کچھ معمولی اور کچھ غیر معمولی اشکال کے باوجود، مولانا عرشی نے الفاظ پر جو اعراب لگائے یا بطور خاص اضافت اور رموز اوقاف کا اہتمام کیا ہے اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

"عرشی صاحب کا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اشعار، فقروں اور اجزا میں اوقاف کا استعمال بڑی فراخ دلی سے کیا ہے۔ جس کی وجہ سے صحیح مفہوم کی طرف رہنمائی ہو جاتی ہے"۔ (رموز غالب، ص ۲۸۹)

رشید حسن خاں جو املا کے مسائل و مباحث سے اچھی طرح آشنا اور الفاظ کے رمز شناس ہیں، نسخۂ عرشی میں مولانا عرشی کی توقیف نگاری اور اضافتوں کے اہتمام کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں بھی بہ طور عموم اضافت کے زیر نہیں ملتے۔ مولانا عرشی نے نسخۂ عرشی میں اس کا التزام کیا ہے، پابندی کے ساتھ اضافت کے زیر لگائے ہیں۔ یہ التزام بہت مفید اور کارآمد ہے۔ اس سے صحیح خواندگی میں قابل قدر مدد ملتی ہے، معانی کے تعین میں مدد ملتی ہے اور املا کی تکمیل ہوتی ہے"۔ (املائے غالب، ص: ۱۹۶)

نسخۂ عرشی طبع ثانی میں چند معمولی نوعیت کے محل نظر مقامات اور بھی ہیں جنہیں ذیل

Scanned by CamScanner

میں اشعار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

نسخۂ عرشی طبع اول کے ''گنجینۂ معنی'' کی ترتیب و تدوین میں ایک اصول یا معیار یہ بھی پیش نظر رکھا گیا تھا کہ اس حصے میں آنے والے قلم زد اشعار میں سے، جن میں غالب نے کچھ ترمیم، اضافہ کر کے متداول دیوان میں شامل کر لیے انہیں درج نہ کیا جائے یعنی جن قلم زد اشعار کی اصلاحی شکل متداول میں آ گئی انہیں صرف ''اختلاف نسخ'' میں ظاہر کر دیا جائے ''گنجینے'' میں شامل نہ رکھا جائے۔ نسخۂ عرشی طبع اول میں اس اصول کی خاص پابندی نہ ہو گی تھی اور کچھ ایسے شعر بھی ''گنجینے'' میں چھپ گئے تھے جن میں ایک مصرعے یا ایک آدھ لفظ یا صرف ردیف کی تبدیلی سے غالب نے متداول میں شامل کر لیے تھے۔ یعنی معمولی فرق والے (جس سے مفہوم میں خاص تبدیلی بھی نہ ہوتی تھی) تقریباً ایک ہی مفہوم کے حامل شعر ''گنجینے'' اور ''نوائے سروش'' دونوں میں آ گئے تھے۔ اس پر ڈاکٹر گیان چند نے لکھا تھا:

> ''عرشی صاحب نے ایسی صورتوں میں کسی یکساں روش کی پابندی نہیں کی۔ کہیں وہ سابق متن کے شعر کو یک قلم خارج کرنے کا مشورہ دیتے ہیں تو کہیں دونوں متون کو علاحدہ اشعار کے طور پر برقرار رکھتے ہیں۔''
>
> (رموز غالب، ص: ۲۶۷)

نسخۂ عرشی طبع ثانی کی ترتیب کے وقت مولانا عرشی نے اس پہلو پر خاص توجہ دی اور طبع اول کے ''گنجینے'' سے ایسے بہت سے اشعار خارج کر دیے جن کی اصلاحی شکل نوائے سروش میں آ رہی تھی مثلاً: صفحہ ۵: شعر ۱۲، ۱۱:۱، ۱۴:۱۳، ۱۵:۱، ۱۷:۵، ۱۹:۹، ۲۰:۱۲، ۸۲:۸ وغیرہ۔ یہ سب طبع اول میں موجود ہیں (اور صفحہ و شعر نمبر طبع اول ہی سے دیا ہے) لیکن طبع ثانی کے ''گنجینے'' میں شامل نہیں۔ سبب یہی ہے کہ ان کی اصلاحی شکل ''نوائے سروش'' میں آ چکی ہے۔ لیکن طبع ثانی کے گنجینے میں ایسے کچھ مزید شعر موجود رہ گئے ہیں اور یہ ہیں بھی ایسے کہ ان سے زیادہ مفہوم کے اختلاف والے (نئے شعر کا درجہ رکھنے والے) اصلاحی شعر تو خارج ہوئے لیکن

Scanned by CamScanner

بہت معمولی فرق، دونوں کو برقرار رکھا ہے طبع ثانی سے ایسی چند مثالیں ملاحظہ ہوں

گنجینۂ معنی، ۱۰:۹۰ مجھ میں اور پھر میں نسبت ہے، ولیکن بعد؟ وصی ختم رسل تو ہے باثبات یقیں

نوائے سروش، ۷:۱۵۱ جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا! وصی ختم رسل تو ہے بفتوائے یقیں

گنجینۂ معنی، ۳:۹۳ حسرت کش یک جلوۂ معنی ہیں نگاہیں کھینچوں ہوں سویدائے دل چشم سے آہیں

نوائے سروش، ۹:۲۲۴ مت مردمک دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں ہیں جمع سویدائے دل چشم میں آہیں

گنجینۂ معنی، ۵:۷۵ لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی امید جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

نوائے سروش، ۹:۲۲۵ لے جاتی ہے کہیں ایک توقع، غالب جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

طبع ثانی کے گنجینے میں آنے والا ایک شعر اپنے قدیم متن پر اصلاح کے باوجود غالب نے متداول میں شامل نہ کیا۔ اب اس کی دونوں صورتیں یہاں (گنجینے میں) چھپ گئی ہیں:

گنجینۂ معنی، ۸:۲۲ اسد ہر اشک ہے یک حلقہ بر زنجیر افزوں بہ بند گریہ ہے نقش بر آب سعی رستن کا

گنجینۂ معنی، ۷:۲۹ ہر اشک چشم سے یک حلقۂ زنجیر بڑھتا ہے بہ بند گریہ ہے نقش بر آب اندیشۂ رستن کا

ایسے اشعار کے بارے میں کوئی ایک اصول طے کر لیا جاتا تو بہتر تھا کہ یا تو اس طرح کے تمام اشعار کو شامل کیا جاتا یا پھر سب کو خارج کیا جاتا۔ جس طرح گیان چند رضا نے ایسے تمام اشعار کو متن میں شامل کر لیا ہے اسی سبب ان کے ہاں نسخۂ عرشی کی نسبت اشعار کی مجموعی تعداد زیادہ ہے۔ نسخۂ عرشی میں، ماخذ کی علامتوں کے علاوہ پانچ طرح کی علامتیں استعمال ہوئی ہیں جو متن میں شامل بعض اشعار کی ترتیب یا انتخاب کی فہم کے لیے آئی ہیں۔ ان تمام علامتوں کے اندراج سے مرتب نسخۂ عرشی کا مقصد پورا نہیں ہو پایا۔ ان میں سے بعض مبہم اور بعض نامکمل رہ گئی ہیں، کہیں بے محل بھی ان کا اندراج عمل میں آیا ہے۔

''گنجینۂ معنی'' کے پہلے قصیدے کے شروع میں ایک لکیر لگی ہے جس کے بارے میں حاشیے میں لکھا ہے:

Scanned by CamScanner

"یہاں اور آگے دو شعروں کے درمیان سادہ لکیر کا مطلب یہ ہے کہ یہاں سے مرزا صاحب نے کچھ شعر نکال کر حصہ اول (نوائے سروش) میں شامل کیے ہیں۔" (نسخۂ عرشی، اصل متن: ۲)

اس علامت میں دو طرح کے اشکال پائے جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ علامت مذکور یعنی سادہ لکیر "گنجینۂ معنی" کے صرف تین قصائد میں اپنے محل پر لگی ملتی ہے۔ اس کے بعد اس کا استعمال کہیں (کسی ایک جگہ بھی) نظر نہیں آتا۔ جب یہ "سادہ لکیر" اس مطلب کے لیے لگائی ہے کہ پتا چل سکے کہ "یہاں سے غالب نے کچھ اشعار نکال کر حصہ اول میں شامل کیے" تو پھر اسے "گنجینۂ معنی" اور "یادآورد" کی غزلیات میں بھی استعمال کرنا چاہیے تھا۔ غالب نے صرف ان قصائد میں سے تو شعر نہیں لیے غزلیات میں سے بھی لیے ہیں۔

دوسرا اشکال اس میں یہ ہے کہ "گنجینے" کے صرف قصائد میں اس سادہ لکیر کے لگا دینے سے یہ تعین قطعاً نہیں ہو سکتا کہ یہاں سے کون سے شعر حصہ اول میں آئے۔ مطلب یہ کہ نظم و غزل کے اشعار کی ابتدائی ترتیب کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ دو لکیروں کے استعمال سے صفحہ پر ایک سطر بڑھ جاتی ہے، ممکن ہے مولانا عرشی نے اپنے مسودے میں قصائد کے بعد یہ اہتمام کیا ہو لیکن طباعت میں یہ ظاہر نہیں ہو سکا۔

"گنجینۂ معنی" ہی میں ایک دوسری علامت کے بارے میں حاشیہ ہے کہ:

"جس شعر کے درمیان ایسا پھول (⊛) بنا ہے وہ بعد کا اضافہ ہے" (نسخۂ عرشی، ص: ۱۲) یہی اظہار مقدمے (ص: ۴۷) میں بھی کیا گیا تھا۔ یہ نشان، اضافہ شدہ شعر کے محاذ میں (دونوں مصرعوں کے درمیان) بنا ہے اور "گنجینۂ معنی" و "نوائے سروش" دونوں میں اس کا استعمال نظر آتا ہے۔ مقدمے یا حاشیے کی محولا عبارت کے علاوہ نسخۂ عرشی کے کسی حصے میں ایسا کوئی اشارہ نہیں، جس سے یہ تعین کیا جا سکے کہ کون سے پھول والا شعر کس نسخے میں پہلی بار اضافہ ہوا۔ نسخۂ عرشی میں اس کے استعمال کی یہ صورتیں رہی ہیں کہ کہیں تو پھول کے نشان والے

Scanned by CamScanner

شعر کے بارے میں اختلاف میں بھی ظاہر کر دیا ہے کہ یہ فلاں نسخے میں پہلی بار اضافہ ہوا اور کہیں یہ اظہار نہیں کیا۔ "ح" اور "حم" کے ساتھ تقابل سے اندازہ ہوا کہ اس نشان والے زیادہ تر اشعار "ق" کے حاشیے والے ہیں لیکن اس صورت میں بھی ایک بے قاعدگی یہ رہی ہے کہ اگر کوئی مکمل غزل کسی نسخے کے حاشیے کی ہے یعنی اپنے سے ماقبل نسخے کی نسبت اضافہ شدہ ہے تو اس کے کسی شعر پر یہ نشان نہیں اور کہیں حاشیے کی مکمل غزل کے اشعار پر یہ نشان ملتے ہیں۔

"نوائے سروش" کی غزل نمبر ۳۲، ۹۱، ۱۳۲، ۱۳۶، ۱۵۷، ۱۶۳، ۱۷۰ اور ۱۷۶ کے تاخذ میں "حاشیہ ق" درج ہو گیا تھا اور ان کے اشعار پر پھول کے نشان بھی موجود ہیں لیکن "صحت نامہ" میں ان کے تاخذ میں سے "حاشیہ ق" کو کالعدم قرار دیا ہے، اور یہ تصحیح شاید (بلکہ یقیناً) "حم" کے حوالے سے ممکن ہو سکی ہے جس کا حوالہ نہیں دیا گیا (نسخۂ عرشی طبع اول میں بھی ان غزلوں کے تاخذ میں "حاشیہ ق" درج ہے)۔

"گنجینے" کی غزل نمبر ۶۵ (ص: ۳۷) ہے جس کے تاخذ میں "ق" اور "قا" کے ساتھ "حاشیہ ق" بھی درج ہے۔ لیکن "ح" اور "حم" کے مطابق اس غزل کا صرف ایک شعر "ق" کے حاشیے پر تھا جو نسخۂ عرشی کے حصہ "نوائے سروش" میں غزل نمبر ۵۵ (ص: ۱۹۸) کے تحت فرد شعر کے طور پر درج ہے اور یہاں اسے "قب" کے حوالے درج کیا ہے۔ لہٰذا "گنجینۂ معنی" کی مذکور غزل (نمبر ۶۵) کے تاخذ میں "حاشیہ ق" کا اندراج نادرست اور "نوائے سروش" میں غزل مذکور (نمبر ۵۵) کے تاخذ میں "قب" سے پہلا تاخذ "حاشیہ ق" درج ہونا چاہیے تھا۔

اسی طرح "نوائے سروش" کی غزل نمبر ۲۸ (ص: ۱۷۶) کے تاخذ میں، "ق، حاشیہ ق، قا" درج ہے۔ لیکن اس غزل کے سات اشعار میں سے کسی ایک پر بھی پھول کا نشان نہیں ہے۔ "حم" کے مطابق اس غزل کا کوئی شعر "حاشیہ ق" کا نہیں لہٰذا نسخۂ عرشی میں اسے "حاشیہ ق" کا ظاہر کرنا سہو ہے (اگر یہ سہو نہیں تو اس میں حاشیے کے اشعار پر پھول کا نشان نہ

Scanned by CamScanner

رہا ہو ہے) جس کی صحیح "استدراک" یا "صحت نامہ" میں بھی نہیں ہو سکی۔

پھول کا نشان زیادہ ابہام اور اشکال کا باعث اس وقت بنتا ہے جہاں کسی غزل کے ایک سے زیادہ مآخذ درج ہوئے ہیں۔ اس صورت میں یہ تعین نہیں ہوتا کہ اس میں نشان زدہ اشعار کس کس مآخذ میں پہلی بار اضافہ ہوئے ہیں مثلاً "نوائے سروش" کی غزل نمبر ۱۹۸ (ص: ۳۰۱) کے تین مآخذ ہیں: "قا"، "گل" اور "قب"۔ ۱۹ اشعار کی اس غزل کے پہلے دو اور آخری پانچ اشعار کے محاذ میں پھول کا نشان ہے۔ "اختلاف نسخ" میں کوئی اشارہ نہیں کہ نشان زدہ یہ سات اشعار مذکورہ تین مآخذ میں سے کس کس میں پہلی بار اضافہ ہوئے۔ "استدراک" کے تحت غزل مذکور کے تیسرے اور چوتھے شعر (جن پر پھول کا نشان نہیں ہے) کے بارے میں "حم" کے حوالے سے حاشیہ ہے کہ:

> "ص ۳۰۱: ۳ و ۴، حاشیہ ق میں یہ شعر گنجینۂ معنی غزل نمبر ۱۹۸ (یہاں ۲۹۸ لکھا ہے جو غلط ہے) کے ہم پہلو اضافہ ہوئے ہیں (حم)"
>
> (نسخۂ عرشی، استدراک، ص: ۵۱۸، کالم: ۲)

بات اور الجھ جاتی ہے۔ یعنی "نوائے سروش" کی زیرِ بحث غزل (نمبر ۱۹۸) میں بغیر پھول کے نشان والے دو شعروں پر بھی یہ نشان ہونا چاہیے اور مآخذ میں "حاشیۂ ق" کا اضافہ ہونا چاہیے (جو "استدراک" میں نہیں کروایا) لیکن باقی نشان زدہ اشعار کے بارے میں کہیں وضاحت نہیں ہو سکی۔ "گنجینے" اور "نوائے سروش" میں اس طرح کی اور غزلیں بھی ہیں جن کے مآخذ ایک سے زیادہ ہیں اور اُن میں سے بعض پر پھول کا نشان بھی لگا ہے لیکن اس کا کچھ تعین نہیں ہو سکتا کہ کون سے شعر کس نسخے میں پہلی بار اضافہ ہوئے۔

مولانا عرشی نے متن کے اضافوں کی تفہیم کے لیے اس علامت کو درج کیا لیکن یہ علامت طباعت میں اُن کی خواہش کے مطابق روبہ عمل نہیں ہو سکی۔ اس اظہار کا آسان طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ الجھاوے سے بچنے اور بچانے کے لیے ہر غزل میں اس کا صرف ایک قدیم

Scanned by CamScanner

ترین ملفوظہ درج کیا جاتا اور اضافوں کو ظاہر کرنے کے لیے پھول کے نشان کی بجائے اشعار کے حاشیے میں نسخوں کے حوالے درج کر دیے جاتے۔ "اختلافِ نسخ" کے لیے [illegible] میں کے اندراج کے لیے پھول کی نسبت کچھ زیادہ تردد بھی نہیں کرنا پڑتا تھا۔

ان دو کے علاوہ باقی تین علامتیں ایک ہی نوعیت کی ہیں جو "گلِ رعنا" (۱۸۲۸ء) اور "انتخابِ غالب" (۱۸۶۶ء) کے تمام اشعار کو ظاہر کرنے کے لیے ہیں کہ کون سی غزل میں سے کون کون سا شعر ان دونوں انتخابات میں آیا ہے۔ ان کے بارے میں مقدمے میں لکھا ہے

> "بہت سے اشعار کے دائیں یا بائیں گ یا خ یا گخ لکھا ہوا ملے گا یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ اشعار گلِ رعنا یا انتخابِ غالب (۱۸۶۶ء) یا ان دونوں میں پائے جاتے ہیں۔" (مقدمہ، ص: ۱۵۷)

نسخۂ عرشی میں ان علامتوں کا اہتمام بھی بڑا معنی خیز ہے کہ ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مختلف ادوار میں غالب کا معیارِ انتخاب کیا رہا ہو گا۔ ان کے بارے میں ایک بات یہ بھی کہنے والی ہے کہ ان دونوں نسخوں میں آنے والے ہر شعر پر گ، خ یا گخ نہیں بلکہ اگر ایک انتخاب کے چند شعر مسلسل آئے ہیں تو وہاں پہلے شعر پر تو یہ علامت لکھ دی ہے، اس کے نیچے والوں پر گ، خ یا گخ کو دہرانے کی بجائے ایضاً کی علامت ( ) لگائی گئی ہے لیکن یہ اتنی خفی ہے کہ بہت توجہ سے دیکھنا پڑتا ہے۔ ان علامتوں کو دائیں یا بائیں لکھنے سے بہتر تھا کہ طے کر لیا جاتا کہ کسی ایک طرف آئیں گی۔ کبھی یہ شعر کے شروع میں یعنی دائیں جانب اور کبھی آخر میں یعنی بائیں جانب آئی ہیں جو بعض اوقات الجھاوے کا باعث بھی بن جاتی ہیں۔ "گ" کی علامت "گنجینۂ معنی" اور "نوائے سروش" دونوں حصوں میں آئی ہے۔ "خ" اور "گخ" صرف "نوائے سروش" میں۔ مقدمے میں "گلِ رعنا" اور "انتخابِ غالب" کے اشعار کے ردیف وار گوشوارے دیے ہوئے ہیں، متن میں بعض شعروں پر ثبت ان علامتوں کو شمار کر کے گوشوارے سے تقابل کیا تو اندازہ ہوا کہ کچھ اشعار میں یہ علامتیں ظاہر نہیں ہو سکیں مثلاً

ہے بھی (ص ۱۰۰)۔ "گل رعنا" میں ردیف الف کی غزلوں کے اشعار کی تعداد ۹۳ ہے جب کہ متن میں گ، رگ اور ایضاً (۔) کی علامتیں "گنجینہ" میں ۸۵ اشعار پر درج ہیں۔ "نوائے سروش" کے ۹۳ اشعار پر درج ہیں، جن کی مجموعی تعداد ۱۷۸ بنتی ہے۔ اب یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ "گل" کے وہ کون سے پانچ اشعار ہیں جن پر یہ علامت نہیں لگائی جا سکی۔ اسی طرح دونوں حصوں (گنجینۂ نوائے سروش) کی ردیف "ت" کے دو دو اشعار پر یہ علامت آئی ہے لیکن "گل رعنا" کے گوشوارے میں اس ردیف کے ۵ شعر ظاہر کیے ہوئے ہیں۔

"انتخاب غالب" (۱۸۶۶ء) کے حوالے سے "ع" اور "گ" یا ایضاً (۔) کی علامت کے استعمال میں بھی یہ اشکال ہے کہ انتخاب کے تمام اشعار پر اس کا اندراج عمل میں نہیں آ سکا مثلاً مقدمے (ص ۱۲۷) میں دیے گئے انتخاب کے گوشوارے کے مطابق اس میں قطعات کے ۴۰ شعر ہیں "نوائے سروش" کے قطعات میں یہ علامت صرف ۳۳ شعروں پر ظاہر ہوئی ہے۔ گوشوارے کے مطابق، انتخاب میں قصائد کے ۹۲ شعر ہیں جن میں ۹۰ پر یہ علامت آئی ہے۔ ردیف الف کی غزلیات کے ۱۳۹ شعر انتخاب میں آئے، جن میں ۱۳۲ شعروں پر یہ علامت آئی۔ ردیف ت کے ۸ منتخب شعر ہیں۔ لیکن متن میں صرف ۵ پر یہ علامت درج ہے۔ غرض یہ کہ "گل" اور "انتخاب" کے حوالے سے یہ علامتیں مکمل طور پر متن کے اشعار پر ظاہر نہیں ہو سکیں جس سے ان علامتوں کے اندراج کا مقصد پورا نہیں ہو سکا۔

دیوان غالب نسخۂ عرشی میں بے شمار خوبیاں ہیں اردو میں تدوین کلام کا جو معیار نسخۂ عرشی نے دیا ہے وہ اُس وقت اور کسی تدوین کی کتاب کو حاصل نہیں تھا اور شاید دیوان غالب کے ترتیب و تدوین شدہ ایڈیشنوں میں کوئی بھی نسخۂ عرشی کے مقابل نہیں ٹھہرتا لیکن نسخۂ عرشی کے حوالے سے جو مشاہدات اور معروضات یہاں پیش کیے گئے ہیں ان کے سبب، اس پر مکمل بھروسا کسی بھی طرح کے غلط نتائج کا باعث ہو سکتا ہے۔

~~~~~~~~~~~

Scanned by CamScanner
~~~~~~~~~~~

حواشی اور حوالہ جات

۱ دیوانِ غالب (کامل) مرتبہ، کالی داس گپتا رضا، بار اوّل، بمبئی: ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ، فروری ۱۹۸۸ء، ص: ۲۳

۲ نسخۂ شیرانی کے ورق ۲، الف اور ب پر اس ناقص مصرع کے بشمول، ایسے تین اصلاحی اضافے ہیں جو نسخۂ شیرانی کے کاتب کے قلم سے ہیں نہ غالب کے قلم سے۔ مولانا عرشی مقدمے میں، اس نسخے کے تعارف کے تحت ان اضافوں کی نشاندہی کے بعد لکھتے ہیں: "مذکورہ بالا تینوں اضافے حال ہی کے کسی شخص کے ہیں"۔ (مقدمہ، ص: ۹۴)۔ نیز قدرت نقوی "حال ہی کے کسی شخص" کے بارے میں قیاس کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "(پنجاب) یونیورسٹی لائبریری میں مخطوطے (نسخۂ شیرانی) کے ساتھ حافظ محمود شیرانی کی تحریریں ملا کر دیکھیں تو احساس ہوا کہ یہ ترمیمیں ان کے قلم کی ہیں"۔ [نسخۂ شیرانی اور دوسرے مقالات، لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، مارچ ۱۹۸۸ء، حاشیہ، ص: ۹] یعنی قدرت نقوی اور خود مولانا عرشی کے مطابق یہ اضافہ غالب کے قلم سے نہیں اس کے باوجود زیرِ بحث اختلافِ نسخ میں سے غالب کا قرار دیا۔ لہٰذا یہ اختلافِ نسخ غلط درج ہو گیا ہے۔

۳ صغیر النساء بیگم، غزلیاتِ غالب کا معروضی تجزیہ، مرتبہ: ڈاکٹر محمد نور الدین سعید، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ نگر، ستمبر ۱۹۸۴ء

۴ پرتھوی چندر، مرقعِ غالب، متعارفہ، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

۵ غالب کے خطوط (جلد سوم) مرتبہ: خلیق انجم، نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۷ء

Scanned by CamScanner

سہیل یوسف

اردو صحافت اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

This article unfolds the contribution of All India Muslim Educational Conference towards Urdu journalism and freedom of press in sub-continent. These efforts of Muslim conference bring change in society. This article analysis effect of Muslim conference on Urdu journalismand it rapid progress.

مغلیہ عہد میں اخبار نویسی کی وہ روایت برصغیر میں موجود نہیں تھی جو انگریزوں اور دیگر یورپی اقوام کے ذریعہ عام ہوئی۔ اس دور میں خبروں کو جمع کرنے کا اہتمام سرکاری اغراض کے لیے ہوتا تھا اور خبروں کی جمع آوری 'وقائع نویس' کرتے تھے۔ ۱۵۵۰ء میں پرتگیزوں نے برصغیر میں پہلا چھاپہ خانہ قائم کیا(۱)۔ اس کے بعد انگریزوں ۱۶۷۴ء میں بمبئی میں مطبع نصب کیا(۲) لیکن باقاعدہ صحافت کا آغاز اور فروغ انیسویں صدی سے ہوا۔ ابتدا میں انگریزی، بنگالی اور فارسی میں اخبارات شائع ہونے لگے۔ ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے اردو کا پہلا اخبار 'جام جہاں نما' جاری ہوا، صرف چھ شمارے چھپنے کے بعد ۱۶ مئی ۱۸۲۲ء سے اس اخبار کی زبان فارسی کردی گئی اور پھر ۱۸۲۳ء میں فارسی خبروں کے ساتھ اردو ضمیمے کا اضافہ کردیا(۳)۔

لارڈ کیننگ نے انقلاب ۱۸۵۷ء سے کچھ عرصہ پہلے اخبارات و رسائل کی آزادی سلب کرنے کے لیے ایک نیا قانون نافذ کیا جس کے ہندوستانی صحافت پر برے اثرات مرتب

Scanned by CamScanner

ہوئے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی نے جہاں ہندوستانی معاشرے کے ہر شعبہ کو متاثر کیا وہاں اس کے اردو صحافت پر بھی گہرے اور منفی اثرات ہوئے۔ برطانوی حکومت نے اردو اخبارات بغاوت میں برابر کا شریک ٹھہرایا اور سزا کے طور پر مسلمانوں کو صحافت سے بے دخل کر دیا گیا۔ ۱۸۵۳ء میں اردو اخبارات کی تعداد ۳۵ تھی جو ۱۸۵۷ء کے بعد صرف چھ رہ گئی (۴)۔ انقلاب سے قبل اردو پریس سیاسی اور خارجی امور میں کافی دلچسپی لیتا تھا اور اس ضمن میں بعض اوقات تیغ وزنش کہہ جاتا تھا لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد اخبارات کا رویہ یک لخت تبدیل ہو گیا انھوں نے اپنے لب و لہجہ کو نرم اور مصلحت کے تابع کر لیا اور سیاست کی جگہ مغربی علوم و فنون کی اشاعت پر توجہ مرکوز کر دی۔

اودھ اخبار:

۱۸۵۹ء میں منشی نول کشور 'اودھ اخبار' لکھنؤ سے جاری کیا جس نے صحافت کو تجارتی خطوط پر استوار کیا۔ یہ اخبار اس وقت جاری ہوا جب ملک کے حالات سازگار نہیں تھے اور حکومت وقت 'باغیوں' کی بیخ کنی میں مصروف تھی۔ اس اخبار پر سرسید نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا

'ہم کو امید ہے کہ ہمارے اور ہم عصر وقائع نگار اودھ اخبار کی تقلید کریں گے اور منشی نول کشور کی عالی ہمتی سے امید ہے کہ ان کا اخبار مثل بڑے انگریزی اخبارات کے روزانہ جاری ہوا کرے گا اور خدا کرے ایسا ہی ہو۔' (۵)

اخبار سائنٹفک سوسائٹی:

سرسید نے صحافت کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اُس کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اپنی تعلیمی و ادبی تحریک کے فروغ کے لیے اسے استعمال بھی کیا۔ انھوں نے عقلی، سائنسی اور علمی مسائل کو اہمیت دی اور عوام کو بلند تہذیبی سطح پر لانے کے لیے ادب کو وسیلہ بنایا۔ ان کے رفقا کار یک

Scanned by CamScanner

وقت ادیب بھی تھے اور مصلح قوم بھی (۶)۔ یہ ادبا، مسائل کا تجزیہ فکری زاویوں سے کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور ادب کو قومی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرتے تھے۔ سر سید نے ۳ مارچ ۱۸۶۶ء سے اخبار سائنٹفک سوسائٹی جاری کیا (۷) شروع میں یہ اخبار ہفت روزہ تھا پھر سہ روزہ ہو گیا اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا۔ آغاز میں سر سید اس میں سیاسی مسائل پر شذرات لکھتے تھے جن کا مقصد یہ تھا کہ ایک طرف حکومت اور انگریز قوم کو ہندوستانیوں کے خیالات سے آگاہ کیا جائے تو ساتھ ہی ہندوستانیوں کو انگریزی طرز حکومت سے آشنا کیا جائے۔ یہ اخبار سر سید کی وفات کے بعد بھی باقاعدگی سے نکلتا رہا۔ اس اخبار کے بارے میں مولانا حالی لکھتے ہیں کہ:

'اس میں سوشل، اخلاقی، علمی اور پولیٹکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے، ہندوستان کے طریق معاشرت یا تعلیم یا کسی علمی یا تاریخی تحقیقات کے متعلق جتنے لیکچر سوسائٹی میں دیے جاتے تھے وہ سب اس کے ذریعے شائع ہوتے تھے۔ اگرچہ یہ اخبار ملک کی سوشل اصلاح کا ہمیشہ ایک عمدہ آلہ رہا۔ یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اس پرچہ کی اصلاح سے شروع ہوئی'۔ (۸)

اس اخبار کی ایک اہم خصوصیت اس کی باقاعدگی تھی اور اس نے اردو صحافت کو کیسے متاثر کیا؟ اس سلسلے میں مولانا حالی رقمطراز ہیں:

'جس قدر آرٹیکل نگاری کا سلیقہ اخباری دنیا میں پھیلا اور نکتہ چینی کی طاقت پیدا ہوئی یہ سب سائنٹفک سوسائٹی گزٹ کی مرہون منت ہے'۔ (۹)

ڈاکٹر سید عبداللہ سر سید کی صحافت کے بارے میں لکھتے ہیں:

'سر سید کی صحافت میں دو باتیں بڑی چمک اور تابانی رکھتی ہیں۔ اول ان

Scanned by CamScanner

> کے مخالف کی پروا نہیں۔ (۳) چھاپ کا حسن اور کاغذ کی عمدگی۔ (۴) دوم میں اخبارات کی مقبولیت۔ اخبارات میں واقعات و معاملات پر بے لاگ رائے جس میں بڑی صداقت یعنی وسعت معلومات اور ضمیر کی نظر جھلکتا ہے جس میں حیات قومی کی تشکیل جدید اور زندگی کی تمدنی اساس کا پورا پورا احساس پایا جاتا ہے۔ (۱۰)

تہذیب الاخلاق:

اخبار سائنٹیفک سوسائٹی ایک سیاسی، علمی، اخلاقی اور معاشرتی اخبار تھا جو سارے ہندوستان کے لیے نکالا گیا تھا۔ جبکہ مسلمان قوم کے اندازِ فکر کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے لیے 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا گیا۔ اس میں ایسے مضامین چھپتے تھے جن سے قوم کا اندازِ فکر بدلنا مقصود تھا۔

تہذیب الاخلاق کا پہلا پرچہ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو شائع ہوا۔ اس شمارے کی تمہید میں سر سید نے تہذیب الاخلاق کا مقصد یہ تحریر کیا کہ مسلمانانِ ہند کو کامل درجہ کی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ ان کا شمار دنیا کی معزز اور مہذب قوموں میں ہو۔ اس لیے اس کے تمام مضامین میں خیالات، رسم و رواج، طرزِ عمل اور معاشرت کی اصلاح پر زور دیا جائے گا اور ہر معاملہ میں عقلی اور تنقیدی اندازِ فکر اختیار کرنے کی تلقین کی جائے گی۔ یہ رسالہ مضامین کے لیے وقف تھا اس نے زندگی کے تمام موضوعات کا احاطہ کیا اور سنجیدہ علمی مباحث کے لیے اردو کو استعمال کر کے اس زبان کی فعالیت کو نمایاں کر دیا (۷)۔ خالدہ ادیب بانو نے 'ان سائٹ انڈیا' میں لکھا ہے کہ:

> 'سر سید کو کسی پہلو سے دیکھا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا پتھر ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا

یہ اس لیے جو تحریکیں انھوں نے اٹھائیں وہ اب تک حرکت میں ہیں خواہ ان کی سمت ہمیشہ وہ نہ رہی ہو جو سرسید پسند کرتے تھے۔'(۱۱)

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین:

جنوری ۱۸۹۳ء میں علی گڑھ سے محمڈن اورینٹل کالج میگزین جاری ہوا۔ جو انگریزی اردو دونوں زبانوں میں چھپتا تھا۔ حصہ اردو کے مدیر شبلی نعمانی تھے۔ اس میں کالج کی خبروں کے علاوہ علوم وفنون، تاریخ اور ادب کے بارے میں مفید مضامین شامل کیے جاتے تھے۔ حالی، محسن الملک، نذیر احمد اور ذکاء اللہ اس کے مستقل مضمون نگاروں میں شامل تھے۔ اس میگزین نے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیا اور علمی، ادبی، تہذیبی وتمدنی تبدیلیوں کا خیر مقدم کیا اب یہ رسالہ کالج میگزین کے طور پر شائع ہوتا ہے تاہم اس کی علمی اور ادبی جہت اور معیار متعدد دوسرے رسائل کے لیے اب بھی مشعل راہ ہے۔ یہ رسالہ علی گڑھ سے ابھرنے والے نئے ادیبوں کا گہوارہ بھی ہے اور اردو ادب کا خزینہ بھی اس کا حال اس کے ماضی کی طرح روشن ہے۔(۱۲)

کانفرنس گزٹ:

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اخبار کانفرنس گزٹ (اخبار ایجوکیشنل کانفرنس) کے نام سے جاری کیا گیا جو ۱۹۸۸ تک برابر شائع ہوتا رہا۔ اس اخبار میں کانفرنس کے اجلاسوں کی رپورٹ کے علاوہ وہ لیکچر بھی شائع کیے جاتے تھے جو کے کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں کے موقع پر اسکالر اور ادباء دیا کرتے تھے۔ کانفرنس کے مقاصد کے پھیلاؤ اور حصول کے لیے اس اخبار نے اہم کردار ادا کیا۔

ماہ نامہ خاتون:

ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبہ خواتین نے ۱۹۰۴ء سے یہ ماہ نامہ جاری کیا اس کے

Scanned by CamScanner

ایڈیٹر شیخ محمد عبداللہ تھے۔ اس رسالے کا مقصد مستورات میں تعلیم پھیلانا اور ان میں لکھنے [illegible] میں علمی مذاق پیدا کرنا تھا۔ اس رسالے کے لکھنے والوں میں مرد بھی شامل تھے جن میں مولوی احتشام حسین اور نذیر ہاشمی نمایاں ہیں۔ خواتین میں مس نصیر الدین حیدر، فاطمہ بیگم اور سر ہے بیگ اہم ہیں۔ 'خاتون' نے اصلاح خواتین اور حقوق نسواں کے لیے موثر انداز میں آواز اٹھائی۔

انجمن ترقی اردو نے بھی بہت سے رسائل و اخبارات جاری کیے۔ یہ تمام اخبارات، رسائل علم و ادب، تعلیم و تدریس، مذہب میں تجدد اور اصلاح معاشرہ کے علم بردار تھے۔ انھی سے اردو ادب میں ہلکے پھلکے مضامین لکھنے کی ابتدا ہوئی اور ان رسائل و اخبارات نے اپنے ہم عصروں اور آنے والوں پر گہرے نقوش ثبت کیے۔

اہم بات یہ ہے کہ جن اخبارات و رسائل نے اس تحریک کی نظریاتی اعتبار سے وکالت کی زبان و اسلوب کے معاملے میں انھوں نے بھی سر سید احمد اور ان کے رفقا کی پیروی کی۔ مارچ ۱۹۳۷ء مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے 'اردو پریس ایسوسی ایشن' کی بنیاد رکھی گئی۔ اس ایسوسی ایشن کے مقاصد درجہ ذیل ہیں (۱۳):

۱۔ اردو صحافت کی ترقی۔

۲۔ اردو صحافت کی اصلاح و سدھار۔

۳۔ پریس کی آزادی کا اہتمام اور تحفظ۔

پریس کے حقوق، صحافیوں اور پبلیشرز کے درمیان اچھے تعلقات کے قیام اور فروغ کے لیے پریس کانفرنس منعقد کی جس کی صدارت مولوی بشیر الدین (ایڈیٹر البشیر) اور منشی دیانرائن نگم (ایڈیٹر زمانہ) نے کی۔ اس پریس کانفرنس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ " پرانے اخباروں اور رسائل کے لیے ڈاک کے رعایتی نرخ مقرر کرے، ہندوستانی پریس ایکٹ کی ترمیم کی جائے اور پریس کو ہندوستانی زبانوں اور رومن رسم الخط میں ٹیلی گرام کرنے کی

Scanned by CamScanner

ہوا جو دہلی کا پہلا اخبار تھا (۱۴)۔
اس تحریک نے صحافت میں علم کا زیور دکھایا (۱۵)۔ سر سید، محسن الملک، وقار الملک، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد، علامہ شبلی نعمانی، مولانا حالی اور جن سے دوسرے معاونین نے رسائل میں اور مقالات کے ذریعے بالواسطہ طور پر بھی اردو صحافت و ادب کی اصلاح کی۔ ان کی تحریروں میں سادگی، متانت اور جامعیت اہم ہیں یہی عناصر اس تحریک کی صحافت کے بنیادی عناصر ہیں۔ ان کی صحافت پر معقولیت غالب ہے جس نے ہم عصر صحافت کو کئی حیثیتوں سے متاثر کرتے ہوئے اس تحریک نے ملک کی تشکیل و تعمیر اور مادی حالات کو سازگار بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

حوالہ جات

۱۔ عبدالسلام خورشید ڈاکٹر، صحافت پاکستان و ہند میں، مجلس ترقی ادب ۲ کلب روڈ لاہور ۱۹۶۳ ص ۱۷

۲۔ انور سدید ڈاکٹر، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد ۱۹۹۲ ص ۲۲

۳۔ ایضاً ص ۲۳۔

۴۔ عبدالسلام خورشید ڈاکٹر، صحافت پاکستان و ہند میں، مجلس ترقی ادب ۲ کلب روڈ لاہور ۱۹۶۳ ص ۹۷۔

۵۔ امداد صابری مولانا، تاریخ صحافت اردو جلد سوم دہلی ۱۹۵۳ ص ۷۸

۶۔ وزیر آغا ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح، مکتبہ عالیہ اردو بازار لاہور ۱۹۹۹ ص ۱۵۴

۷۔ طارق محمود ربعہ، سر سید احمد خان، بک کارنر جہلم پاکستان ۱۹۸۸ ص ۷۷

Scanned by CamScanner

۸۔ الطاف حسین حالی مولانا، 'حیات جاوید' دوست ایسوسی ایٹس الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور ۲۰۰۳ ص ۷۶

۹۔ ایضاً ص ۷۷

۱۰۔ سید عبداللہ ڈاکٹر، 'تہذیب الاخلاق کی اہمیت' رسالہ برگ گل کراچی سرسید نمبر ص ۱۷

۱۱۔ مسکین علی حجازی پاکستان و ہند میں مسلم صحافت کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۹ ص ۵۰

۱۲۔ ایضاً ص ۵۵

۱۳۔ عبدالسلام خورشید ڈاکٹر، 'کاروان صحافت' انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۶۴ ص ۶۷

۱۴۔ ہاشم فرید آبادی (مرتب) 'تاریخ انجمن اردو' انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۵۲ ص ۹۸

۱۵۔ عبدالسلام خورشید ڈاکٹر، 'صحافت پاکستان و ہند میں' مجلس ترقی ادب ۲ کلب روڈ لاہور ۱۹۶۳ ص ۱۰۲

ہاشم شیر خان

اُردو کا ایک قدیم رسالہ۔ سین ٹیفک ٹری ٹیز

The author found four issues of monthly Scientific Treatise edited by Munshi Piary Lal from November 1867 to Febrary 1868. He discusses its content spanning several branches of science, morality, philosophy and metaphysics. He dwels upon its linguistics and form which is interestingly the conversation between a teacher and his pupil.

نومبر 1867ء کا چھپا ہوا اردو زبان میں سائنسی ادب کا ایک ماہنامہ رسالہ 'سین ٹیفک ٹری ٹیز' یعنی رسالہ علمی میری نجی لائبریری کی خوب صورت زینت ہے۔ خوش قسمتی سے مجھے اس کے پہلے چار مکمل نسخے (نومبر 1867ء سے فروری 1868ء تک) بیک وقت دستیاب ہوئے۔ اس قدیم رسالہ کا حوالہ میری نظر سے کہیں نہیں گزرا، میرا یہ دعویٰ محدود تحقیق و مطالعہ کا شکار ہے، ہو سکتا ہے اس کا ذکر کسی ایسی تصنیف و تحریر میں موجود ہو، جہاں تک میری رسائی تاہنوز نہ ہو سکی ہو۔ یہ بھی ممکنات میں سے ہے، کہ اس رسالہ کی اشاعت صرف انہی چار شماروں تک آ کر بندش کا شکار ہو گئی ہو۔ بہ ہر حال ایک کہنہ اور گمنام رسالہ ہونے کے ناتے اس کے متعلق بنیادی اور ٹھوس معلومات کی جانکاہی کسی آبلہ پائی سے کم نہیں۔

یہ رسالہ شاگرد و استاد کے گفت گوؤں پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ نام سے بھی ہویدا ہے، یہ رسالہ زیادہ تر تحقیقی انداز میں سائنسی، علمی اور طب کے متعلق انتہائی اہم موضوعات کے

Scanned by CamScanner

گر مستعمل ہوئے (اردو / [illegible]) ... دیگر مشرقی علوم و فنون اور ایجادات و اصطلاحات پر چل رہا ہے

اس میں فارسی کا اسلوب سے زیادہ [illegible] اصطلاحات کی محسوس ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ [illegible]

علمی و سائنسی موضوعات کا [illegible] سائنسی موضوعات میں قلم زنی کیا ہے۔ اس کے علاوہ [illegible]

بعض ایسی مخصوص [illegible] اور ایسے الفاظ و اصطلاح [illegible] ہیں، جو اردو کے اسلوب [illegible]

انداز میں [illegible] ہیں اور ایسے [illegible] کثرت الفاظ بھی موجود ہیں، جو اردو املا میں الفاظ کے [illegible]

ہیں، جو جدید اردو میں مستعمل نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر اوسکو (اس کو) [illegible] (اس میں)

کرچکو ایسے (کرنے کے واسطے) [illegible] (انھوں کی) اونہوں (انہوں) اوسکے (اس کے)

اوپر (اس پر) چاہئیے (چاہیے کہ) اوسے (اسے) اوسمضمون (اس مضمون) لیوا (لیا)

اسلئیے (اس لیے کہ) کرکر (کرکے) کہولکر (کھول کر) پگہلا (پگھلا) سہولت (یہ سہولت)

ترکیب (یہ ترکیب) وہانتک (وہاں تک) نکالنے (نکالنے سے) پانیمیں (پانی میں) وغیرہ

سے جگہ جگہ واسطہ پڑتا ہے۔ بعض اردو الفاظ کا املا مروجہ املا سے مختلف ہے، جیسے: دہات

(دھات) دیکہو (دیکھو) تہے (تھے) تہا (تھا) بہی (بھی) پہر (پھر) گہر (گھر) کہانے

(کھانے) کہا (کھا) ٹہنڈا (ٹھنڈا) بہوک (بھوک) اچہا (اچھا) بڑہوں (بڑھوں)

بہٹکی (بھٹکی) پوچہا (پوچھا) بچہونے (بچھونے) کہڑا (کھڑا) چڑہایا (چڑھایا) چوتہی

(چوتھی) کچہ (کچھ) لکہے (لکھے) منہہ (منہ) آنکہہ (آنکھ) بچہ (بچ) لائیق (لائق) یہہ

(یہ) پہونچی (پہنچی) سوچے (سوچیے) وغیرہ۔ ایسے ان گنت الفاظ بھی ہیں، جن کے آخر میں

نون غنہ آتا ہے، مگر ان میں نقطہ موجود ہے، جو اردو املا میں ساقط ہے۔ مثال کے طور پر: مین

(میں) ہان (ہاں) ہین (ہیں) ہون (ہوں) نہین (نہیں) جذبون (جذبوں) کہین (کہیں)

چہپان (چھپاں) ہدون (ہدوں) کہان (کہاں) کرین (کریں) فرماوین (فرماویں) جاوین

(جاویں) چندان (چنداں) رہین (رہیں) خرابیان (خرابیاں) بیماریان (بیماریاں) جاتین

(جاتیں) لیمون (لیموں) جوانون (جوانوں) بخشین (بخشیں) ہان (ہاں) جہلیان

Scanned by CamScanner

(تتلیاں)، پھول (گملوں) وغیرہ۔ ہر رسالہ میں تین صفحات باب ختم ہونے کے بعد حاشیائی ملاحظات کے پیش نظر خالی چھوڑ دیے گئے ہیں۔ چاروں شماروں میں شاگرد نے اپنے استاد سے دو سو انچاس سوالات کے جوابات پوچھے ہیں، ہر شمارہ میں تمام سوالات کی تقسیم بندی یوں کی ہے۔

پہلے شمارے میں 39 سوالات، دوسرے میں 48، تیسرے میں 74 جب کہ چوتھے شمارے میں 58 سوالات موجود ہیں۔ 'سین ٹیفک ٹری ٹیز' کی تقطیع 12x21 سم ہے، ضخامت کم سے کم 48 صفحات اور زیادہ 56 صفحات ہے۔ کھردرا کاغذ استعمال کیا گیا ہے، اور اس کا ورق تھوڑی سی بد احتیاطی یا تیز ہوا کے سبب پھٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ کتابت قدیم طرز کی ہے اور بڑے اہتمام و سلیقے کے ساتھ لفظوں کو برتا گیا ہے، کہ کہیں بھی ایک لفظ کی غلط کتابت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ ہر دو رسالہ دو کالمی ہے۔ طباعت بھی بڑے اہتمام سے کی گئی ہے، سرورق چاروں طرف ایک ہی رنگ کے عمدہ اور دیدہ زیب بیل بوٹوں سے مزین ہے۔ اس پر پوری عبارت یوں درج ہے (پہلے رسالے کے ٹائٹل کا عکس ملاحظہ کیجئے)

ہوالمعز

نمبر 1 — جلد نمبر 1

سین ٹیفک ٹری ٹیز

یعنی

رسالہ علمی

بابت

ماہ نومبر ۱۸۶۷ء

ہر مہینے مین ایک دفعہ

باہتمام منشی پیارے لال پرنٹر مطبع کوہ نور لاہور مین

Scanned by CamScanner

ہے 192

قیمت فی جلد

۸/

اس کا ٹائٹل انگریزی میں ہے 'سائنٹیفک ٹریٹیز' کے ہر نمبر سے کے ابتدا میں انگریزی میں مضامین بابت کی فہرست دی گئی ہے۔ اس کی طباعت و اشاعت مطبع کوہ نور لاہور سے ہوئی تھی اور فی پرچہ قیمت آٹھ آنے درج ہے۔

اس کا پہلا شمارہ نومبر 1867ء

اس جلد میں 39 سوالات پر بحث کی گئی ہے۔ ابتدا میں انگریزی میں فہرست دی گئی ہے۔

No.	Contents	Page.
	Preface,	1
1.	Moral Powers (Chapter Ist)	1
2.	Immortality of the soul proved by Analogical reasonings,	23
3.	Purity of Gold and other solidsand fluids ascertained by specific gravity,	27
4.	Preservation of health,	45

دیباچہ سے ہی 'سینٹیفک ٹریٹیز' کا آغاز ہوتا ہے۔ جس میں اس رسالہ کی غرض، غایت، علوم اور ایجادات وغیرہ سے متعلق ڈیڑھ صفحے سے زیادہ صراحت موجود ہے۔

'ناظرین اس رسالہ پر واضح ہو کہ علم جوہر بے بہا ہے و دولت بے زوال۔ ابتدائے مخلوقات میں جبکہ انسان لباس علم سے عریان تھا و وحشی

Scanned by CamScanner

مشہور ہیں وہ مربی انسان کہلاتے ہیں۔ مطلب اصلی جاری کرنے اس رسالہ کا یہہ ہے کہ وہ فواید و اصول علوم سے بذریعہ اسکے واقف ہو کر مایل بہ طرف تحصیل علم ہوں اور اپنی طرف سی نئی نئی ایجادیں کریں اور اون سے خود بھی فایدہ اوٹھاویں و مرفع الحال ہو جاویں اور خلقت کو اپنی ایجادوں سے فواید کثیر بخشیں اور اس دیرنا پایدار میں نام حاصل کریں اور تا ابدالدھر مستحق تحسین و آفرین رہیں۔

فہرست کے مطابق پہلا باب 'علم اخلاق' کے متعلق ہے، جس میں شاگرد کے 19 سوالات کے مدلل جوابات استاد نے بڑی وضاحت کے ساتھ دیے ہیں۔ پہلا باب اکتالیس اوراق پر مشتمل ہے۔ جس میں مغربی و یونانی مفکرین کنٹ اوڈ، کلارک، پرایس، سوئس، پلیی ہیوم، ستراط، پورفری، پی ارمش، پیتھی گورس، تھیلس اور بروس کے نظریات و خیالات اور تجربات پر بحث کی گئی ہے۔ ایک مقام (صفحہ نمبر 5) پر حضرت سلیمان علیہ السلام کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ اس باب کا آخری صفحہ خالی چھوڑ دیا گیا ہے۔ دوسرا باب 'رسالہ علم الٰہیات' صفحہ 23 سے شروع ہوتا ہے، جس میں روح کے متعلق شاگرد کے چھ سوالات استاد کے جوابات کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ باب صفحہ 36 تک پھیلا ہوا ہے۔ صفحہ 37 پر 'رسالہ علم طبیعی' کا آغاز ہوتا ہے، جس کے ٹائٹل کے نیچے یہ عبارت، 'ترکیب خالص دریافت کرنے سونے و چاندی و جمیع اجسام مجسم و مائیات کی بذریعہ وزن مخصوص' درج ہے۔ جس میں شاگرد نے مختلف دھاتوں کے متعلق استاد سے چھ سوالات دریافت کیے ہیں۔ یہ باب صفحہ نمبر 43 تک پھیلا ہوا ہے۔ اس موقع پر سونا کی خالص اصلیت کے متعلق شاگرد کے ایک سوال پر استاد نے ایک تاریخی واقعہ سنایا ہے۔

'ایکمرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ ہیرو شاہ سریکیوز نے ایک بڑا سونے کا تاج بنوایا جب زرگر تیار کر کے لایا تو وہ بڑا خوش قطع و زیبا تھا شاہ نے اپنے مصاحبین سے استفسار کیا کہ کوئی ایسی ترکیب بھی ہے جس سے بدون د

Scanned by CamScanner

تو اس نے چاہا کہ وہ دریافت ہو جائے کہ سونا خالص ہے اور اسکے اندر کاریگر نے کوئی اور شے ملاوٹ نہیں کی ہے۔ حکما اس بات کو فکر و طرح طرح کی میں پڑ گئے اور جواب سوال کا معقول نہ دے سکے لیکن حسن اتفاق سے ایسا ہوا کہ جب ارکمیدس حکیم دریا میں نہاتا تھا کہ یکبارگی پانی میں ہاتھ کو ہلایا کر اسکو فوراً قاعدہ خالص دریافت کرنے سونے کا سوجھا اور وہ بے تحاشہ پانی میں سے خوشی کے مارے نکل آیا اور اسنے روبرو شاہ کے تاج سونے کو بہ ترکیب بالا پانی میں تول کر صاف کہہ دیا کہ اس سونے میں کھوٹ ملایا ہے پس جبکہ سونے کو آگ میں پگھلا کر دیکھا تو فی الحقیقت اسقدر کھوٹ کہ حکیم نے بیان کی تھی اسقدر نکلی۔

آخری باب "رسالہ قواعد محافظت جسمانی" پر بحث ہے جس میں شاگرد کے آٹھ سوالات استاد کے جوابات کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ باب صفحہ نمبر 44 تا 48 تک ہے۔ جو طبی جسمانی کے متعلق ہے

جلد دوم اٹھارہ دسمبر 1867ء

اس کی فہرست علیحدہ علیحدہ صفحات پر انگریزی اور اردو میں دی گئی ہے۔ انگریزی بابت فہرست اس طرح ہے۔

No.	Contents	Page.
1.	Of the Government of God by rewards and punishments, and particularly of the latter	1
2.	On Astronomy-proofs of the carths revolution round the sun, & c.,	15

Scanned by CamScanner

On the properties of a magnet, 35
3 The sign of conception and that of
4 the birth of a male or a female child, 43
Natural Philosophy _ Pneumatics, 47

5. دوسرے صفحے میں محولہ بالا فہرست کو اردو کے سانچے میں یوں ڈھالا گیا ہے۔

نمبر شمار	خلاصہ مضمون	صفحہ نمبر
۱	علم الٰہیات درباب اسکیکہ خالق اس دنیا مین انعام وسزا سے حکمرانی کرتا ہے، خصوصا سزا سے	—
۲	علم ہیئت، درباب ثبوت گردش زمین وغیرہ	۱
۳	رسالہ مقناطیس درباب خواص مقناطیس	۱۵
۴	ترکیب دریافت کرنے حمل کی اور علامات شناخت اس امر کے کہ لڑکا پیدا ہوگا یا لڑکی	۳۵
۵	علم طبیعی درباب ہوائے محیط زمین	۴۳
		۴۷

فہرست کے اگلے صفحے میں 'التماس مہتمم کوہ نور' کے عنوان سے مصنف 'سین ٹیفک ٹری ٹیز' کے متعلق مختصر دیباچہ میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

شروع ماہ گذشتہ سے جو اس مطبع مین یہ رسالہ علمی سین ٹیفک ٹری ٹیز نام جاری ہوا ہے اوسکے فواید اور نتائج نیک کے شرحکی ضرورت نہین ہے عیان راچہ بیان مگر یہ بات قابل عرض کرنے کے ہے کہ پچھلے رسالہ کی پہونچنے پر ہر چند بہت سے صاحبون نے مہربانی فرمائی اور بذریعہ تحریرات اطلاع دی اور اس رسالہ کو پسند اور منظور فرمایا اور براہ مہربانی تائید بھی کی اور جناب فضیلت مآب مسٹر الگذنڈر صاحب بہادر

دیکھکر مدارس علاقہ لاہور نے اوّلی جلد بحضور جناب صاحب ڈائرکٹر بہادر فرمائی اور جناب ممدوح نے کل مدارس ضلع کے واسطے اس کی جلدیں منظور فرمائیں اور ایسی صاحبان ڈائرکٹر بہادر اشاعت علوم اضلاع مغربی شمالی واودھ وناگپور و بنگال کیخدمتین تحریک پیش ہے یقین ہے کہ جناب ممدوحین بھی قدردانی و فیض رسانی فرماوینگے اب یہ جلد دوم تیار ہوئی ہے جو بدستور سابق سب صاحبوں کی خدمتین ارسال کیجاتی ہے اور سمجھنا چاہئے کہ جن صاحبوں نے پچھلے جلد کے واپس بھیجنے پر کچھ جواب نہیں دیا ہے وہی اسکو منظور فرماتے ہیں اسواسطے آئندہ بھی اونکی خدمتین اور جلدیں ارسال ہوتی رہینگی اور زرقیمت طلب کیا جاویگا۔

بعد ازاں صفحہ نمبر 1 پر 'علم الہیات' کا باب شروع ہوتا ہے۔ اس میں شاگرد کے آٹھ سوالات استاد کے جوابات کے ساتھ صفحہ نمبر 13 تک محیط ہیں۔ صفحہ نمبر 14 کو خالی چھوڑ دیا گیا ہے۔ دوسرا باب صفحہ نمبر 15 پر 'علم ہیئت' کے متعلق علمی بحث چھیڑی گئی ہے۔ جس میں زمین، سورج، چاند، اور دوسرے سیارات کی اوقات گردش، حجم، آبی بخارات، کشش ثقل، سورج گرہن، چاند گرہن وغیرہ کو موضوع سخن بنا کر ان کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ استاد نے یورپی و یونانی ہیئت دانوں کیپلر، نیوٹن، اور ہرشل کے نظریات و تجربات کو بھی حوالے کے طور پر ماخذ بنایا ہے۔ اس میں گیارہ سیاروں کی جدول بھی موجود ہے، جو فاصلہ اور اوقات مقررہ گردش گرد آفتاب ہیں۔ یہ فہرست درج ذیل ہے۔

نام	فاصلہ	اوقات مقررہ گردش گرد آفتاب
عطارد	37000000	87 دن 23 گھنٹہ 15:30 منٹ
زہرہ	68000000	224 دن 16 گھنٹہ 49:15 منٹ
زمین	95000000	365 دن 6 گھنٹہ 9 منٹ

Scanned by CamScanner

مریخ	144000000	686دن 23 گھنٹہ 30 3/4 منٹ
مشتری	نامعلوم	نامعلوم
پلس	نامعلوم	نامعلوم
جونو	نامعلوم	نامعلوم
وستا	نامعلوم	نامعلوم
مشتری	494000000	قریب بارہ سال کے یا4333دن 8 گھنٹہ 51:30 منٹ
زحل	9020000000	10761دن 14 گھنٹہ 3/4"36 منٹ
ہرشل	1805000000	30445دن 18 گھنٹے

اس میں استاد نے یہ بتایا ہے کہ زمین کے گرد چاند اپنا ایک دورہ 27دن 7 گھنٹے 43منٹ اور کچھ سیکنڈ میں مکمل کرتا ہے اور چاند ایک مہینے میں اپنے محور پر ایک دورہ مکمل کرتا ہے۔ یہ باب اٹھائیس سوالات و جوابات پر طوالت رکھتا ہے، جو صفحہ نمبر 34 تک چلا جاتا ہے۔ چاروں شماروں میں سب سے زیادہ سوالات اس باب میں ملیں گے۔

صفحہ 35 پر رسالہ مقناطیس شروع ہوتا ہے۔ جس میں آٹھ سوالات اور اس کے جوابات، صفحہ نمبر 42 تک موجود ہیں۔ اس باب میں مقناطیس کے بنانے کی تراکیب، فوائد، لوہے کے ساتھ اس کا ٹکراؤ اور خاص سمت میں اس سے دوری وغیرہ کے متعلق معلومات کا خزانہ موجود ہے۔ اس میں استاد نے واضح کیا ہے کہ دورِ جہالت میں اقوام سیاہ کس طرح مقناطیس کے فوائد سے آگاہ تھی اور اسے کس طرح کام میں لایا جاتا تھا، خصوصاً دنیا کے سمندروں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے کے لیے کس طرح مقناطیس کو وسیلہ بنایا جاتا رہا ہے، اور اہل فرنگ مقناطیس سے بنایا جانے والا ایک آلہ بنام میرینر کمپس کو استعمال کر کے ہند پہنچے۔

صفحہ نمبر 43 پر باب 'ترکیب' ہے جس کے عنوان کے نیچے یہ عبارت درج ہے۔

Scanned by CamScanner

اور یافت کرنے حمل کے اور علامت شناخت اس امر کی کہ لڑکا پیدا ہوگا یا لڑکی

اس میں شاگرد کے چار سوالات اور جوابات صفحہ 46 تک موجود ہیں۔ جو طب کی دنیا میں انتہائی معلومات افزا اور اہمیت کے حامل ہیں۔ انہیں پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ جب طب نے ترقی نہیں کی تھی تو دور جہالت میں طریقہ علاج طبیعی کس آلہ کے کتنا سہل اور کارآمد ہوتا تھا۔ اس موقع پر شاگرد کا ایک سوال استاد کے جواب کے ساتھ من و عن نقل کر دینا مناسب ہوگا تاکہ پڑھنے والے پر یہ آشکار ہو، کہ پرانے وقتوں میں طب کے ماہرین نے معلومات حاصل کرنے کے لیے کیسے طریقے دریافت کیے اور کامیاب ٹھہرے، اور جو طبی ترقی میں بنیاد ثابت ہوئے۔

شاگرد:۔ ——— اکثر اشخاص اس بات کے بڑے راز جو ہیں کہ کس طرح حمل از تولد اولاد دریافت و تحقیق ہو جاوے کہ عورت حاملہ کو لڑکا پیدا ہوگا یا لڑکی۔ یقین ہے کہ اگر کسی کتاب مین علامات اسکے آپ کی نظر سے گزرے ہون گے تو آپ بیدریغ اوس کے بیان سے اس نیاز مند کو مرہون و ممنون فرماوینگے۔

اوستاد۔ ہان مجھے ایک علامت اسکی تحقیق معلوم ہے جسکا امتحان اکثر لوگوں نے کیا ہے اور اون کی شہادت پر مجھے اعتبار کلی ہے اور عقل بھی اوس علامت کی صحت پر گواہی دیتی ہے۔ ترکیب دریافت کرنے اس امر مستفسرہ کی یہہ ہے کہ جس عورت کا دریافت حال ولادت فرزند یا دختر منظور ہو اوس کے دودھ کے چند قطرے گلاس پانی مین ڈالکر دیکھو کہ اگر وہ قطرے تہ نشین ہون تو بہ یقین جانو کہ اوسکو لڑکی پیدا ہوگی اور درصورتیکہ وہ پانی پر تیرے یا پھسل جاوے تو ضرور لڑکا تولد ہوگا۔

الٹرا ساؤنڈ نے اب اس آسان طریقہ کو غیر معروف بنا دیا ہے، ورنہ پرانے وقتوں

Scanned by CamScanner

[illegible] مضمون [illegible] ادا کیا گیا ہے۔

صفحہ نمبر ۴۷ پر [illegible] کے ساتھ [illegible] علم طبیعی [illegible] رسالے کے آخری صفحہ نمبر 55 تک [illegible] ہے۔ اس میں [illegible] کی پہلی [illegible] کے متعلق انسان کو حاصل ہونے والی [illegible] کے متعلق [illegible] ہے۔

۳۔ نمبر ۲ شمارہ فروری 1868ء

یہ شمارہ 54 صفحات میں ہے۔ صفحہ نمبر 1 سے پہلے انگریزی میں داخلی مضامین کی فہرست ہے۔

No.	Contents	Page.
1	Moral Philosphy-man and his passions	1
2	Alchemy and Chemistry	19
3	Electricity	31
4	Natural Philosphy-on heat.	41
5	Experimental Philosophy	47

اس کے اگلے صفحے پر اردو میں فہرست ہائے کی ترتیب یوں دی گئی ہے:۔

نمبر شمار	خلاصہ مضمون	صفحہ نمبر
۱	علم اخلاق درباب جذبات انسان	۱
۲	مہوسی و کیمسٹری	۱۹
۳	الیکٹریسٹی	۳۱
۴	علم طبیعی درباب اثر حرارت	۴۱
۵	تجربات حکمت	۴۷

اگلے صفحے پر انتساب جنتقم کوہ نور کے عنوان سے مصنف کا مجمل دیباچہ موجود ہے۔
اس میں دوسرے شمارے کے دیباچہ ہائے کو ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں پہلے صفحہ پر علم اخلاق کے عنوان سے شاگرد کے پچیس سوالات کے ساتھ شمارے کی ابتداء ہوتی ہے۔ علم اخلاق کے موضوع پر شاگرد و استاد کی یہ گفت گو صفحہ 17 پر چلی جاتی ہے۔ جس میں انفعال اور محرک انفعال کے متعلق اچھا خاصا تنقیدی مباحثہ پڑھنے کو ملتا ہے۔ اس باب کا اگلا صفحہ نمبر 18 خالی چھوڑ دیا گیا ہے۔ صفحہ نمبر 19 پر شاگرد کے چودہ سوالات پر مبنی دوسرا باب 'سوی وعلم کیمیا گری' کا آغاز ہوتا ہے جو صفحہ نمبر 30 تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں سونا چاندی کے بنانے اور مختلف کیمیائی دھاتوں کو ڈھالنے کے متعلق کیمسٹری کے یورپی ماہرین مسٹر گرجی، ڈاکٹر بلیک، ڈاکٹر پریسٹلے، مسٹر کونڈیش، مسٹر لوافیر فرانسیسی اور مسٹر جوفری کے تجرباتی فارمولوں پر سیر حاصل گفت گو کی گئی ہے۔

رسالہ کا تیسرا باب صفحہ نمبر 31 پر 'ایلکٹریسٹی' کے عنوان سے شروع ہوتا ہے جو شاگرد کے پندرہ سوالات اور ان کے جوابات پر قادر ہے۔ اس میں ایلکٹریسٹی کی تعریف و تاریخ اور اس کے وجودی فوائد و نقصانات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ شاگرد نے ایک دلچسپ سوال ایلکٹریسٹی کے مادی اور غیر مادی ہونے کے متعلق بھی کیا، جس کے جواب میں استاد نے اسے مادی کہا ہے۔ ایک اور سوال کے جواب میں استاد نے ڈاکٹر فریکلن کے اس نظریات کو کہ ایلکٹریسٹی اور بجلی ایک ہی شے ہے، کی بھرپور تائید کرتے ہوئے اس پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے۔ اس باب میں اکثر چھوٹے چھوٹے سوالات اور ان کے جوابات اسی نسبت سے دیے گئے ہیں، تمثیلاً یہ کہ کیا انسانی بالوں میں ایلکٹریسٹی موجود ہوتی ہے۔ استاد نے مجمل جواب دیتے ہوئے کہا، کہ اگر ہاتھی کا کنگھا اندھیرے میں جلد جلد بالوں میں پھیریں، تو شعلہ ایلکٹریسٹی نکلے گا، اور دوسرا سوال یہ کہ کیا بعض اقسام کی مچھلیوں کو چھونے سے ایلکٹریسٹی کے وجود کا احساس ہوتا ہے، اس پر استاد نے وضاحت کرتے ہوئے جواب دیا، بعض ایسی مچھلیوں کا وجود ہے کہ جنہیں ہاتھ سے یا کسی دھات وغیرہ کی لکڑی سے چھوئیں تو ایلکٹریسٹی کا سخت جھٹکا لگے گا، اوران خاص قسم کی مچھلیوں کو

Scanned by CamScanner

موم کی تکڑی سے مس کریں تو یہ اثر پیدا ہوگا۔ ایسی مچھلیوں کا اثر بہت دور تک جاتا ہے۔ اس نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا، کہ اگر کوئی شخص جو بحری جہاز پر سوار ہے، اپنا ہاتھ باہر سمندر کے پانی میں ڈال لے، اور اس قسم کی کوئی بھی مچھلی اس وقت پندرہ فٹ کے فاصلے پر پھرتی ہو، تب بھی اثر صدمہ الیکٹریسٹی اسے محسوس ہوگا۔ یہ باب 39 صفحے تک موجود ہے، جب کہ اس کا اگلا صفحہ نمبر 40 خالی چھوڑا گیا ہے۔

چوتھا باب 'علم طبیعی' کے متعلق ہے۔ جس کا دائرہ صفحہ نمبر 41 سے 46 تک ہے۔ اس میں شاگرد نے استاد سے گیارہ سوالات کے جوابات پوچھے ہیں۔ پانچواں باب جو اس رسالے کا آخری حصہ ہے۔ 'تجربات حکمت' کے عنوان سے ہے جو صفحہ نمبر 47 سے 54 تک موجود ہے۔ جو شاگرد کے نو سوالات اور استاد کی طرف سے دیے گئے جوابات پر مبنی ہے۔ جس میں جنتر، منتر، سحر و جادو کے طریقہ کار و اسباب اور نقصانات کے متعلق بحث کی گئی ہے۔

۳۔ چوتھا شمارہ فروری 1868ء

اڑتالیس اوراق کے حامل اس شمارے میں شامل انگریزی فہرست کو یوں ترتیب دی گئی ہے:۔

No.	Contents	Page.
1.	Moral Government of God-State of Probation as implying trial, difficulties and danger,	1
2.	Optics,	21
3.	The Education of children,	31
4.	Laws of the Chemical attraction,	41
5.	Mechanical Powers,	47

Scanned by CamScanner

[illegible]

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۱	علم الحیات در باب اس کہ دیا جاسے امتحان ہے اور نتائج علم علیحدہ علیحدہ بطریق سوال و جواب کے بیان کرتا ہے	۱
۲	علم طبیعی در باب مرایا و مناظر	۲۱
۳	در باب تعلیم اطفال	۳۱
۴	کیمسٹری	۴۱
۵	علم طبیعی در باب جرثقیل	۴۶

اگلا صفحہ رسالہ کے مصنف کا دیباچہ "التماس مترجم" کو مونوز کے نام سے حسب سابق ہے۔ پہلے باب کی ابتدا "علم الحیات" سے ہوتی ہے، جو صفحہ نمبر بیس تک چلا جاتا ہے۔ جس میں شاگرد کے گیارہ سوالات بجلی اور ہوا اور سرد و گرم کے متعلق ہیں۔

دوسرا باب "رسالہ مرایا و مناظر" ہے، جو شاگرد کے پچیس سوالات و استاد کے جوابات پر مشتمل ہے۔ یہ باب صفحہ تیس پر ختم ہوتا ہے، جس میں استاد نے اکثر سوالات کے چھوٹے چھوٹے جوابات دیے ہیں، جو جامع اور معلومات افزا ہیں۔ اس میں فرنگ اور یونان کے حکماء کے تجربات، مشاہدات و نظریات پر گفت و شنید کی گئی ہے۔ ایک موقع پر نیوٹن کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ اس میں سورج و چاند سے نکلنے والی شعاعوں اور انسانی چشم کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔

صفحہ نمبر اکتیس پر "در باب تعلیم" شروع ہوتا ہے، جو شاگرد کے آٹھ سوالات پر مبنی ہے۔ یہ باب صفحہ نمبر 40 پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یہ باب تعلیم کے متعلق موضوع کو احاطہ کرتا ہے اور لوک نامی ایک حکیم کی کتاب جو اس نے اصول باب تعلیم پر رقم کی ہے، کا حوالہ ملتا ہے۔ اس میں تعلیم اطفال کے حوالے سے خاصی بحث چھیڑی گئی ہے، کہ کس طرح اطفال سے برتاؤ کرنا چاہیے اور ان کے روزانہ اوقات کار کو کیسے ترتیب دینا چاہیے، تاکہ وہ کسی نظم و ضبط میں رہیں اور اپنی

Scanned by CamScanner

عادات کو قابو میں رکھیں۔ مسٹر لوک کے طریقہ تعلیم پر استاد کے زور دینے کی وجوہات یہ تھیں کہ مسٹر لوک نے خانگی تعلیم کو مدارس سرکاری پر ترجیح دی ہے۔

چوتھا باب 'کیمسٹری' کے عنوان سے ہے، جو صفحہ چھیالیس پر شروع ہوتا ہے۔ یہ باب شاگرد کے چھ سوالات پر مبنی ہے۔ اس میں کشش کیمیائی کے متعلق دو تا چھ قاعدے امثال کے ساتھ سمجھائے گئے ہیں۔ جس میں خاص کر پھٹکری، سلف سوڈا اور شیشہ بنانے کی ترکیب بتائی گئی ہیں۔ آخری باب علم طبیعی (در باب جزئیات) ہے، جس میں شاگرد نے مجملاً گیارہ سوالات استاد سے کیے ہیں، جو صفحہ نمبر 47 تا 50 تک احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اس میں شاگرد اور استاد کے مابین یہ مباحث موجود ہیں، کہ پرانے زمانے میں بڑی بڑی مخروطی عمارات کیسے بنتی تھیں، اور اس وقت انتہائی وزن دار اشیا کو کس طرح بلندی پر لے جایا جاتا تھا۔

Scanned by CamScanner

ہو الغنی

نمبر ۱ [illegible] جلد ۱

سینٹیفک ٹریٹیز

رسالہ علمی

بابت

ماہ نومبر سنہ ۱۸۶۶ء

ہر مہینے مین ایک دفعہ

باہتمام منشی پیارے لال نیچر مطبع کوہ نور لاہور مین

چھپا ہے

قیمت فی جلد

۸/

ابرار عبدالسلام

'تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک' میں منقول تاریخوں کا تحقیقی مطالعہ

History writing is an exceptional art and an important part of historical literature. Since times immemorial, it has been the tradition that poets have composed verses on important events and issues. Not only in this art a tedious job but it is also a challenge for the historians. This article is a research study of known historiographies till the year 1700. An effort has also been made to understand the art of history writing of different historians.

ڈاکٹر گیان چند جین کا شمار موجودہ عہد کے نامور محققین میں کیا جاتا ہے۔ ان کے وسیع مطالعے، تحقیقی صلاحیت اور ادبی تاریخ پر گہری نظر سے کسی طور انکار ممکن نہیں۔اسی طرح دکنی اردو ادب پر جن محققین کو تخصیصی امتیاز حاصل ہے ان میں ایک بڑا نام ڈاکٹر سیدہ جعفر کا بھی ہے۔ان دونوں محققین کی مشترکہ تحقیقی کاوش فکر کے نتیجے میں ایک ایسی ادبی تاریخ سامنے آئی ہے جسے اول الذکر محقق نے ''اب تک کی بہترین ادب کی تاریخوں میں بہترین تاریخ'' قرار دیا ہے۔(۱) یہ تاریخ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کی طرف سے پانچ جلدوں میں ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی ہے۔اس تاریخ کو لکھنے

ہوئے دونوں محققین نے موجودہ عہد تک اردو ادب کے حوالے سے لکھی جانے والی
تحقیقات سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ پانچوں جلدوں میں موجود تحقیقی حوالوں کی کثرت اس
بات کا واضح ثبوت ہے۔

تاریخ ادب کا ایک اہم ماخذ وہ 'تاریخیں' بھی ہیں جو شعرا نے مختلف اوقات
میں کہی ہیں۔ بہت سے واقعات کی صحیح صورت حال اور سنین، تاریخی تصانیف میں دستیاب
نہیں۔ یہ 'تاریخیں' ہی ہیں جو بہت سے اہم واقعات پر پڑے ہوئے دبیز پردوں کو اٹھانے
اور صحیح صورت حال واضح کرنے کے ساتھ ساتھ، ولادت، وفات اور اہم واقعات کے صحیح
سنین متعین کرنے میں ایک مؤرخ یا محقق کی مدد کرتی ہیں۔ اردو کی ادبی تاریخ کے اہم
واقعات کی تاریخیں اسی فن کی بدولت محفوظ ہو گئی ہیں۔ انھی تاریخوں کی بدولت ہماری ادبی
سیاسی، ثقافتی اور تاریخی روایت کی مستند ادبی تاریخ مرتب کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اگرچہ
اردو میں اس فن نے شمالی ہند میں انیسویں صدی میں معراج کمال حاصل کیا لیکن جنوبی ہند
بالخصوص دکن اور گجرات میں بھی اس فن کے قابل قدر نمونے دستیاب ہوئے ہیں۔ دکن
میں اس روایت نے فارسی شاعری کے زیر اثر رواج پایا۔ سلطنت بہمنیہ، عادل شاہی اور
قطب شاہی عہد میں ایسے بے شمار شاعر گزرے ہیں جو کسی بھی اہم واقعہ کی تاریخیں کہتے
نظر آتے ہیں۔ کوئی اہم واقعہ رونما ہو، کسی اہم شخصیت کی ولادت یا وفات ہو، کوئی بادشاہ
تخت نشین ہو، معزول ہو، صحت یابی پائے یا فتح یاب ہو، کوئی اہم عمارت تعمیر ہو یا کوئی
غیر معمولی واقعہ پیش آئے، اس عہد کے شعرا اس کی تاریخ کہتے اور اس کے صلے میں انعام
حاصل کرتے نظر آتے ہیں۔ عادل شاہی اور قطب شاہی حکمرانوں نے اس فن کی خوب
سرپرستی کی۔

اگرچہ اس فن کے قابل قدر نمونے کثیر تعداد میں اس عہد میں فارسی ہی میں
دستیاب ہوئے ہیں لیکن اس کے باوصف قدیم اردو میں بھی بہت سے نمونے دیکھنے کو ملتے

Scanned by CamScanner

ہیں۔ دکن میں اردو تاریخ گوئی کی روایت میں نصرتی ایک ایسا شاعر گزرا ہے جو ہر گو کی طرح بات بات پر تاریخ کہتا نظر آتا ہے۔ اگرچہ اس کی کہی ہوئی بیشتر تاریخیں اس کے مرثیوں کی طرح گوشۂ گمنامی میں مستور ہیں لیکن جتنی تاریخیں دستیاب ہوئی ہیں ان میں نصرتی کی فنی گرفت چابکدستی اور مہارت کو دیکھتے ہوئے اسے جنوبی ہند کا تاریخ کہا جا سکتا ہے۔

'تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک' کی پہلی تین جلدوں میں ہمیں کثیر تعداد میں تاریخی مادے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان مادوں کو دونوں محققین نے مختلف واقعات کے سنین متعین کرنے کے حوالے سے مذکورہ تاریخ میں نقل کیا ہے۔ ان 'تاریخوں' کو دیکھتے ہوئے میرے جیسا نو آموز طالب علم بھی ورطۂ حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ ادبی تاریخ لکھنے والے ایسے ممتاز مؤرخین بھی اس فن کے اصول و نکات سے اتنے بے بہرہ ہیں کہ ان میں سے ایک مؤرخ کو مادۂ تاریخ درج کرتے ہوئے اور ان سے مطلوبہ سنہ کا استخراج کرتے ہوئے کماحقہ واقفیت بھی حاصل نہیں۔ اس تاریخ میں نہ صرف مادہ ہائے تاریخ غلط نقل ہوئے ہیں بلکہ ان سے غلط سنین بھی برآمد کیے گئے ہیں۔ اس عمل میں ڈاکٹر گیان چند سے کہیں کہیں اور ڈاکٹر سیدہ جعفر سے تقریباً ہر کہیں تسامحات ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر کے درج کردہ مادہ ہائے تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہی یہ بدگمانی ہونے لگتی ہے کہ انھیں فن تاریخ گوئی کے اصول و قواعد، فنی پیچیدگیوں اور فارسی زبان سے کماحقہ واقفیت نہیں۔ ان کی ان معاملات سے نا آشنائی کا یہ عالم ہے کہ انھیں بعض اوقات تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کس شعر میں کون سا مادۂ تاریخ مستور ہے؟ اور ان سے کس طرح مطلوبہ سنہ برآمد ہوتا ہے؟ اور بعض اوقات تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ جن اشعار کو وہ نقل کر رہی ہیں ان کے کسی مصرع یا جزو مصرع میں کوئی مادۂ تاریخ مستور ہے بھی یا نہیں؟

Scanned by CamScanner

تاریخ گوئی کی بنیاد عددی قیمت پر ہوتی ہے اسے اس فن کے جاننے والوں نے مقرر کیا ہے۔ تاریخ کہنے والا بعض اوقات کسی لفظ یا لفظوں کے مجموعے، کسی مصرع یا کسی بڑے مصرع، آیت، حدیث، قول، فقرے، عبارت، یا شعر کی مدد سے سنہ ہجری یا سنہ عیسوی میں کسی واقعہ کے رونما ہونے کے سنہ کا تعین کرتا ہے۔ سنہ کا تعین عددی قیمت پر ہوتا ہے۔ اگر مادۂ تاریخ نقل کرنے میں ایک حرف کی بھی کمی بیشی ہو جائے تو مادۂ تاریخ سے صحیح اور مطلوبہ سنین برآمد نہیں ہوتے۔ بعض اوقات مادۂ تاریخ زیادہ اور بعض اوقات کم اور بسا اوقات غلط نقل ہوئے ہیں۔ یہ ایسی فروگذاشتیں ہیں جن کے متعلق کسی مؤرخ سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ لیکن ایک ایسی ادبی تاریخ جو مستند کہلائے جانے کی دعوے دار ہو، اس میں اس قسم کے کثیر تسامحات ان کے مذکورہ دعوے کی تردید کرتے نظر آتے ہیں۔ مندرجہ ذیل سطور میں بالترتیب ان مادہ ہائے تاریخ کو نقل کیا جا رہا ہے جو غلط درج ہوئے ہیں یا ان سے مطلوبہ سنین برآمد نہیں ہوتے۔ ذیل میں ان مادوں کی نشاندہی ہی نہیں کی گئی بلکہ ان کے اعداد نکال کر صحیح صورت حال بھی واضح کی گئی ہے۔ اور یہ بتانے کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ صحیح مادۂ تاریخ کیا ہے؟۔ اور اس سے کس طرح مطلوبہ سنہ برآمد ہوتا ہے؟

(۱) محمود گاواں کا مدرسہ ۸۷۷ھ (۱۴۷۲ء) میں تعمیر کیا گیا تھا۔ حسب ذیل قطعۂ تاریخ سے اس کا ثبوت ملتا ہے

ایں مدرسہ رفیع و محمود نیا — تعمیر شدہ است بہ اہل صفا
آثار قبول ہیں کہ تاریخش — از آیت ابنا تقبل منا (جلد اول ص ۱۵۶)

۸۷۷

آخری مصرع کے نیچے ۸۷۷ھ مرقوم ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پورا مصرع مادۂ تاریخ ہے اور اس سے ۸۷۷ھ برآمد ہوتے ہیں۔ دراصل مادۂ تاریخ آخری تین لفظ ہیں یہ قرآنی آیت ہے جسے غلط نقل کیا گیا ہے۔ آیت کا پہلا لفظ 'ابنا' نہیں بلکہ

Scanned by CamScanner